بوند بوند ساگر

ستیش بترا

نامی پریس لکھنؤ

۱۹۶۳ء

قیمت 2 روپے

"الوک" وزیر حسن روڈ لکھنؤ۔۱

بکھر گئے تنکے	۹
چنگاری	۳۳
تیس سال پہلے	۳۹
روتھانگ پاس	۴۷
نئے پرانے	۶۷
سسکیاں اور اندھیرا	۷۷
ریشمان	۹۱
قلمی دوستی	۱۰۳
ایکسپرٹ	۱۱۹
اجنبی	۱۲۹
کانٹا	۱۴۱
الجھنیں	۱۵۹
سوکھا جھرنا	۱۶۹
پکارتے ہیں یہ زمین و آسماں...	۱۸۱
کیپٹن پرساد	۱۹۱
دوسرا بیٹا	۲۰۱
میں اور میرے افسانے	۲۱۳

مصنف کی دوسری تصنیف

ویران بہاریں

مکتبۂ کہانی کار
لکھنؤ

نئی بات، نیا انداز

منظر سلیم

گزشتہ چند برسوں میں بعض بہت ہی اچھے نئے افسانہ نگاروں کی طرح ہمارے جن پرانے لکھنے والوں نے اپنی کامیاب تحریروں کی طرف اہل نظر کی توجہ مبذول کرائی ہے اور جو نئے نئے راستوں کو اپناتے ہوئے ایسی نئی منزلوں تک پہنچے ہیں جن تک پہنچنا اوسط درجہ کی سوجھ بوجھ اور صلاحیت رکھنے والوں کے بس کی بات نہیں، ان میں **ستیش بترا** خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لیکن ان نئے افسانہ نگاروں اور بترا اور ان کے بعض دوسرے ہم عصروں کے افسانوں میں فن اور زندگی کے متعلق اختیار کیا جانے والا بنیادی رویہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ نئے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جھنجھلاہٹ اور غصے کی شدید کیفیت کئی لحاظ سے ان کا حسن اور سب سے موثر حربہ بن جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ جھنجھلاہٹ اور غصہ "انگارے" کے دور کے افسانہ نگاروں کی جھنجھلاہٹ کی طرح تیز یا معاشرے کی بندشوں اور خامیوں کے خلاف، منٹو، عصمت اور اور ان کے بعض دوسرے ہم عصروں کے جوانی کے افسانوں میں بلند

ہونے والی صدائے احتجاج کی طرح تلخ اور موثر نہیں اور اب اس میں کسی حد تک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے پھر بھی نئے لکھنے والے اس کیفیت کو اپنی تخلیقات میں نمایاں اہمیت دیتے ہیں اس کے برخلاف ستیش بترا کے افسانوں میں جھنجلاہٹ اور غصہ کی کیفیت طرۂ امتیاز کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کے افسانوں میں جو گرمی اور حرارت ملتی ہے وہ زندگی کی کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے مچلتے ہوئے دل کی نہیں، بلکہ کسی خیال، کسی نقطۂ نظر یا کسی نظریہ حیات کے اظہار کے لئے تڑپتے ہوئے دماغ کی پیداوار ہے۔

بترا کے افسانوں کے موضوعات اتنے ہی متنوع ہیں جتنی کہ خود زندگی۔ ان کی فکر کسی خاص ماحول میں اسیر ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں اور عام انسانوں کے دکھ درد، نشاط و مسرت، چھوٹی بڑی الجھنوں، تمناؤں اور خوابوں کا تجزیہ کرتی ہے اور ان کی ایسی تصویریں پیش کرتی ہے جو عام زندگی میں آئے دن نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں "فلسفہ بگھارنے یا علمیت کی دھونس" ڈالنے کے قائل نہیں لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ عام بول چال کے لب و لہجہ اور سیدھے سادے انداز میں وہ اپنی تقریباً ہر کہانی میں انسانی زندگی کا کوئی نہ کوئی گہرا نفسیاتی پہلو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاید یہی ان کی کامیابی کا اہم راز بھی ہے۔

بترا کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا جب کہ ان کی پہلی کہانی لاہور کے ایک ممتاز رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے

افسانوں کا پہلا مجموعہ "ویران بہاریں" جنوری سنہ ۶۶ء میں شائع ہوا اور اب ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "بوند بوند ساگر" شائع ہو رہا ہے۔ پہلی کہانی اور دس تازہ ترین مجموعہ کی اشاعت تک لگ بھگ بیس برس کا یہ عرصہ ایک ایسے ذہین اور باشعور نوجوان کی جدوجہد سے بھری ہوئی زندگی کا آئینہ دار ہے جو ادب میں زندگی کی ترجمانی پر یقین رکھتے ہوئے ادب اور زندگی دونوں میدانوں میں کامیابی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

زندگی کے میدان میں ہنرا کو جو تجربات ہوئے ان سے انھوں نے ادب کے میدان میں پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ اس عرصہ میں وہ اپنے فن کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد پوری ادبی دیانت داری اور لگن کے ساتھ جاری رکھی۔ چنانچہ "ویران بہاریں" کے بعد ان کے جو افسانے ہندستان اور پاکستان کے مختلف معیاری رسالوں میں شائع ہوئے اور جو اب کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں ان میں ان کے ذہنی ارتقا کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

ہنرا نئی بات کو نئے ڈھنگ سے کہنے میں یقین رکھتے ہیں انھوں نے مطالعہ، مشاہدہ اور خاص طور سے انگریزی ادب کے گہرے مطالعہ سے کہانی کے فن پر پوری طرح گرفت حاصل کی ہے۔ ان کے افسانوں کا آغاز، نقطۂ عروج اور اختتام تینوں منزلیں کہانی کار کے ذہنی سفر کے اہم موڑ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان کی یہ فنی

پختگی ان کی کہانیوں کی جان ہے اور اسی کے سہارے انھوں نے
اپنے تجربات و مشاہدات کو بوند بوند کر کے ساگر کی شکل دے دی
ہے۔ ایک ایسا ساگر جو بظاہر شانت معلوم ہوتا ہے لیکن جس
میں ہزاروں طوفان چھپے ہوئے ہیں ——— !

بکھر گئے تنکے

چھوٹی بہن کے نام

میں نے گزشتہ سات سال کے عرصے میں تمھاری عدم موجودگی کو زندگی کے ہر موڑ پر نہایت شدت سے محسوس کیا ہے۔ جب بھی میری زندگی میں کوئی سہانا لمحہ آیا اور میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ میں اس لمحہ میں گھر میں سے کسی اور کو بھی شریک کروں، میری آنکھیں ہمیشہ تمھاری طرف اٹھیں لیکن تمھیں نہ پاکر آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔

نہ جانے لوگ کیوں تمھارا ذکر آنے پر میری اور تمھاری بھابی کی تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں بھائی ہو تو ایسا ہو، بھابی ہو تو ایسی ہو کوئی ان میں سے یہ کیوں نہیں کہتا کہ بہن ہو تو ایسی ہو اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں کبھی بھی تمھاری اس پرخلوص انمول محبت اور شیریں دعا کو اس شدت سے نہیں لوٹا سکا جو تمھارے دل

میں ہم سب کے لئے تھی ۔ یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ تم نے اس جوان عمر میں جب کہ تمہاری ہم عمر لڑکیاں کسی یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہوتی ہیں ، ہم سب سے منھ موڑ لیا۔

کل ہی کی تو بات ہے جب تمہارا بیاہ ہوا تھا ۔ لال بھائی صاحب کے تعلق والے مکان کے سامنے باغ میں شامیانے لگے تھے ۔ میں نے اور دیپک نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد اس شامیانے کو بیلے کی لڑیوں سے ، کاغذ کی رنگین جھالروں سے ، پھولوں کے ہاروں سے رنگ برنگے غباروں سے سجایا تھا ۔ تم نے برآمدے کے سامنے والے کمرے میں بیٹھے مہندی لگواتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے کہا تھا کہ اس طرح کی سجاوٹ تو کوئی پروفیشنل ڈیکوریٹر بھی نہیں کر سکتا تھا اس جملے میں اپنے بھائیوں پر کتنا غرور ، کتنا اعتماد جھلکتا تھا ۔

اور پھر رات کو بیاہ کی رسوم ختم ہونے پر جب تمہاری سہیلیوں نے وداع کا تڑپتا ہوا گیت گایا تھا اور بیاہ منڈل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور تم خود زار و زار رو رہی تھیں تو میں نے آکر تمہیں دلاسا دیا تھا ، تمہاری آنکھیں پونچھی تھیں اور تمہارا ہاتھ تمہارے پتی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا تھا " پگلی ! کبھی خوشی کے موقعہ پر بھی رویا کرتے ہیں ! تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ تمہیں کتنا اچھا پتی ملا ہے ! " تو تم نے یکدم جیسے اپنے آپ پر قابو پالیا تھا اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے ۔

اور اگلی صبح جب تم سسرال جانے کے لئے بھائی ، بہنوں ، بھاوجوں اور دوسرے رشتہ داروں سے وداع ہونے کے لئے گلے لگ رہی تھیں تو میں جان بوجھ کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا ۔ دراصل مجھ میں یہ تاب ہی نہ تھی کہ میں تمہیں ہنستے ہوئے

وداع کر سکوں اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسروں کی طرح میری آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑیں ۔ لڑکی اپنے گھر جاتی ہے ۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی پھلواری مہکاتی ہے ۔ اس میں دکھ کی کیا بات ہے ؟

لیکن انسان کتنا کمزور ہوتا ہے ۔ بعض دفعہ وہ خود اپنے کہے کو عمل میں نہیں لا سکتا ۔ مجھے اس وقت پوری شدت سے اس کا احساس ہو رہا تھا ۔ میں دور کھڑے ہوئے بھی محسوس کر رہا تھا کہ تمھاری آنکھیں کسی کو بار بار تلاش کر رہی تھیں اور جب تمھاری نظریں مجھ پر پڑیں تو تم سب کو چھوڑ کر میری طرف بڑھ آئیں ۔ تمھارے گالوں پر آنسو ؤں کے دو خوب صورت موتی ٹکے ہوئے تھے اور تم ہچکیاں لے رہی تھیں لیکن جب تمھاری آنکھیں مجھ سے ملیں تو تم نے شاید محسوس کیا کہ تمھیں اس وقت رونا نہیں چاہیئے اور جب تم میرے پاس آکر بولیں ۔

" بھیا ۔ کیا تم مجھے رخصت نہیں کروگے ؟ " تو تمھاری آواز میں کوئی لرزش نہ تھی ۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان امنڈنے ہی والا تھا کہ میں نے اس پر قابو پانے کی غرض سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے تمھارے گالوں پر ٹکے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ دیا تھا ۔

" ہمیشہ سکھی رہو ۔ سہاگونتی رہو ! " اور تم اور تمھارا پتی آشیرواد لینے کے لئے جھک گئے ۔ جب تم میرے قدموں کو چھو کر اٹھیں تو تم میں ایک عجب طرح کی خود اعتمادی آگئی تھی ۔ تمھاری آنکھوں میں ایک چمک تھی اور تم نے مجھ سے بغلگیر ہوتے وقت کہا تھا " جگ جگ جیو میرے بھیا ، جگ جگ جیو ! "

اور مجھے اس وقت ایسے معلوم ہوا تھا گویا یہ الفاظ کہہ کر تم نے جنم جنم کیلئے مجھے مقروض کرلیا ہو۔ اس کے بعد کسی کے لئے بھی یہ کہنا کہ میں نے تمھارے لئے کچھ بھی کیا تھا نہایت غلط تھا۔

اور تم نے پھر مجھے کچھ کرنے بھی کب دیا تھا! قسمت کتنی ستم ظریف تھی! تم سات دن کی تھیں جب ماتا جی کا دیہانت ہوگیا تھا۔ کتنے جتنوں سے تمھاری پرورش ہوئی۔ کتنی ہی بار پتا جی اور دادی جی تمھاری زندگی سے مایوس ہو گئے تھے لیکن پھر بھی تم بچ گئیں۔ تم سات سال کی تھیں جب پتا جی کا سایہ بھی ہم لوگوں کے سروں سے اٹھ گیا۔ یہ تو ہماری دادی جی کا صدقہ تھا جس نے ہم سب کو اپنے بچوں کی طرح پالا ہمیں زندگی کی گرم و سرد ہواؤں سے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بچائے رکھا۔ بڑے تینوں بھائی اپنی اپنی نوکریوں پر تھے۔ تم، اجیت، اور میں دادی جی کے ساتھ اپنی تعلیم کی غرض سے لاہور میں تھے۔ گھر میں سب سے بڑا مرد میں تھا اور میری عمر پندرہ برس کی تھی۔ تم سب کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ قدرت بھی کتنی موقع شناس تھی یا یوں کہنا چاہیے کہ دادی جی صرف اس بات کا انتظار کر رہی تھیں کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جاؤں تو وہ ہمیں چھوڑ کر چل دیں۔ اس وقت تم پندرہ سال کی تھیں، مجھے اب تک یاد ہے کہ تم ان کی موت پر کس طرح سے دھاڑیں مار کر روئی تھیں۔ تمھیں بلکہ ہم سب کو زندگی کی جھلسا دینے والی تپش کا اندازہ صرف اسی روز ہی ہوا تھا۔

مجھے ابھی ملازمت ڈھونڈنی تھی اور اگر مجھے ملازمت مل بھی جاتی تو میرے ہاں تمھاری صحیح دیکھ بھال کے لئے کوئی عورت نہ ہوتی۔ اس لئے تم بڑی بھابی کے ہاں بنگلور چلی گئیں۔ چھوٹا بھائی اجیت کالج ہوسٹل میں داخل ہوگیا اور میں اپنی قسمت آزمانے کے لئے کسی منزل کی جستجو میں نکل پڑا۔ ہماری چھوٹی سی کائنات

بکھر گئی تھی!

بنگلور سے آنے والے خطوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ تم خوش تھیں لیکن آہستہ آہستہ یہ خطوط شکایتوں میں تبدیل ہو گئے۔ تم اپنی من مانی کرنے لگی تھیں۔ تم اپنی غلط قسم کی سہیلیوں کی وجہ سے ایک غلط راستے پر چل نکلی تھیں۔ تمہارا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ تم باغی تھیں، تم سرکش تھیں۔ ہم سب بھائی ان باتوں کو سنتے رہے۔ میں تمہاری دشواریاں سمجھ رہا تھا۔ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے یہ ضروری تھا کہ بھائی صاحب اور بھابی دونوں ہی کام کرتے۔ بھائی صاحب فیکٹری چلے جاتے اور بھابی اپنے اسکول تمہاری طرف کون دھیان دیتا! تمہارا وقت سہیلیوں کے درمیان زیادہ گزرنے لگا۔ اس میں تمہارا قصور نہیں تھا! شام کو جب بھائی صاحب اور بھابی گھر لوٹتے تو شاید وہ اتنا تھک گئے ہوتے کہ وہ تمہاری بابت سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ تمہاری پریشانیوں کو سمجھ نہیں سکتے تھے اسی لئے بجائے ہمدردانہ طور پر تمہاری رہبری کرنے کے وہ شاید تمھیں ڈانٹنے لگتے۔ یا شاید وہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر سیر و تفریح کے لئے چلے جاتے۔ تم زندگی کے اس حصے میں تھیں جہاں جذبات دماغ کو مغلوب کئے رہتے ہیں تمھیں ان کی ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو سمجھنے کا شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ نتیجے کے طور پر تم باغی قرار دی گئیں!

اس دوران میں میری شادی ہو چکی تھی۔ تم نے اپنی بھابی شارداکو پسند بھی کیا تھا اور اس نے تمھیں بھی۔ میں شادی کے فوراً بعد ہی اپنی معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ لیکن اب زندگی میں کچھ سکون آچکا تھا۔ میں نے شاردا سے تمھیں اپنے پاس منگوانے کی بات کی تو اس نے نہایت گرمجوشی سے اس بات کی تائید کی۔ اس نے کہا تھا

کہ میں اکثر دوروں پر رہتا تھا اور تمہاری قربت اس کے لئے بھی ایک سہارا بنے گی۔ ایک بات جو ہم دونوں کے ذہنوں میں تھی وہ یہ تھی کہ اس چھوٹے سے مکان میں جو صرف ڈیڑھ کمرے پر مشتمل تھا اور اس مختصر سی تنخواہ میں دہلی جیسے شہر میں گزارہ کس طرح ہوگا۔ یہ ظاہر تھا کہ تمہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے خرچ کی ضرورت ہوگی اور اب چونکہ تمہیں کالج میں داخلہ لینا تھا یہ اخراجات بھی کسی حد تک بڑھ چکے تھے۔ لیکن ہم دونوں کو اس کی پروا نہ تھی۔ ہمارے خیال میں ہر انسان کی تقدیر اپنے ساتھ تھی اور یہ کہنا نہایت مشکل ہے کہ کون انسان کسی کی تقدیر کا دیا کھاتا ہے۔

تم آئیں۔ تمہیں شروع شروع میں ایک گھٹن کا احساس ہوا لیکن تم ہماری خندہ پیشانیاں دیکھ کر سب کچھ بھول گئیں۔ تم نے اس ماحول میں سے نکل کر حسب عادت اپنی سہیلیاں بنانی شروع کیں۔ تم پر اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن تمہاری بھابی اکثر تمہارے ساتھ ہوتی اس نے تمہیں پہچاننے کی کوشش کی تمہارے مذاق کو سمجھنے کی کوشش کی اور خود تمہیں تمہاری ہم مذاق لیکن اچھے گھروں کی لڑکیوں سے تمہاری دوستی کرائی، تمہاری یا تمہاری سہیلیوں کے آنے جانے پر کوئی غیر معمولی بندش نہ تھی۔ تم سہیلیوں کے ساتھ پکچر جانا چاہتیں تو ستارہ نے ہمیشہ ہم سب کے اکٹھے پکچر دیکھنے کی ترغیب دی۔ کون سی پکچر جانا چاہئے اس کا فیصلہ اور اختیار ہمیشہ تم پر ہوتا، تم سستی گھٹیا رومانوی فلمیں دیکھنا چاہتیں تو ہم میں سے کوئی اعتراض نہیں کرتا لیکن تم دو ایک مرتبہ کے فوراً بعد ہی جھینپنے لگیں۔ اب رفتہ رفتہ تمہاری یہ خواہش ہونے لگی تھی کہ تم معیاری پکچر منتخب

کر کے اپنے اچھے مذاق کا سکہ جما بیٹھ ۔۔ اسی طرح سے تم سستے بازاری ناول اور رسالے چھوڑ کر اچھے ادب کی طرح متوجہ ہوئیں ۔ تمھاری دلچسپیاں آہستہ آہستہ گھریلو کاموں کی طرف بڑھنے لگیں۔

تمھیں آئے ہوئے شائد دوسرا مہینہ تھا ۔ تمھیں کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ تم نے شائد اگلے روز کالج کی اکٹھی تین مہینوں کی فیس لے جانی تھی ۔ تم نے شاردا سے اس کے بارے میں کہا تھا ۔ شاردا نے جب یہ سنا تھا تو وہ محض مسکرا دی تھی لیکن ان دنوں ہمارا ہاتھ تنگ تھا ۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس بارے میں کیا کیا جائے کہ دوپہر کی ڈاک سے مجھے یہ اطلاع ملی کہ میں اپنی فرم کے سیلز کمپیٹیشن میں فرسٹ آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے پچاس روپے کا منی آرڈر مل گیا ۔ اور شاردا نے شام کو اندرونی حالت بتائے بغیر تمھارے ہاتھ میں تمھاری فیس کے پیسے تھما دیئے تھے ۔ باتوں باتوں میں جب تمھیں یہ پتہ چلا کہ مجھے سیلز کمپیٹیشن میں پہلا انعام ملا تھا تو تم خوشی سے چلا اٹھی تھیں ۔" بھیا ۔ ہم تم سے پارٹی لیں گے " تو میں ایک لمحہ سوچ میں پڑ گیا تھا "کیوں نہیں ؟" میرے منہ سے نکلا تھا اور عین اس وقت شاردا نے آکر کہا تھا " کم تم پارٹی کو کیا کرو گی ؟ یہ لو میں اس ہونیوالی پارٹی کے پیسوں سے یہ قمیص شلوار کا کپڑا تمھارے لئے لے آئی ہوں !" اور تم اس کپڑے کو دیکھتے ہی اچھل کر شاردا کے گلے سے لگ گئی تھیں ۔" اوہ میری بھابی ! میری اچھی بھابی !" اور میں اپنی آنکھوں میں امنڈتے ہوئے عقیدت کے ان آنسوؤں کو روک نہیں سکا تھا اور میں فوراً وہاں سے اٹھ گیا تھا ۔ کیونکہ یہ قمیص شلوار کا وہی کپڑا تھا جو چند ماہ پہلے میں شاردا کے لئے لایا تھا !

اور چند دنوں بعد جب میں نے شاردا سے اس بارے میں گفتگو کی اور اسے ٹٹولنے کی کوشش کی تو اس نے کہا تھا ۔" واہ ! دینے والا مجھے اس سے بھی اچھے کپڑے دیگا ۔ تم کیوں گھبراتے ہو ؟"

اور اگلی بار میں پھر اپنے سیلز کمپنی میں فرسٹ آیا اور اس دفعہ مجھے سو روپے کا انعام ملا۔ جب میں نے یہ پیسے شاردا کو دیے تھے تو اس نے کہا تھا۔ "میں نہ کہتی تھی کہ مجھے دینے والا اچھے سے اچھے کپڑے دے گا!" اور اس بار جب تمھیں اس انعام کے بارے میں معلوم ہوا تو تم شاردا کو سیدھا گھسیٹ کر بازار لے گئی تھیں، تم نے اسے کپڑے بھی نہیں بدلنے دیے تھے اور تم شاردا کے لئے ایک خوبصورت قمیص اور میرے لئے ایک خوشنما ٹائی لائی تھیں۔ اور پھر تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے شاردا کے لئے اور قمیص شلوار سی دیے تھے۔

تم نے اب پڑھائی کے فالتو لمحات میں نہایت تندہی سے سلائی اور رسوئی گھر کے دوسرے امور سیکھنے شروع کر دیے۔ ان سب کے لئے خرچ کسی نہ کسی طرح خود بخود نکلتا آتا۔ تم میں گھر کو سجانے کا شوق دن بدن پیدا ہو جاتا رہا تھا ہر ماہ شاردا تمھیں کچھ نہ کچھ کپڑا سلائی اور کڑھائی کے لئے لا دیتی اور تم نے ایک بار نہایت سادگی سے پوچھا تھا۔ "بھابی تم اتنے ڈھیر سارے کپڑے کیوں اٹھا لاتی ہو؟ کتنے تک بناؤ گی آخر؟" اور شاردا نے تمھارے گالوں میں چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا۔

"کسم کیا تمھیں اپنا گھر نہیں بنانا کیا! تمھیں یہ رنگ پسند ہے نا؟" اور تم اس خیال سے کتنا شرما گئی تھیں۔

اور پھر ایک دن جب میں گھر لوٹ کر آیا تھا تو تم بہت خوش تھیں۔ تم جیسے میرا انتظار کر رہی تھیں، تمھارے ہاتھوں میں اون اور سلائیاں تھیں، اور تم چھوٹے چھوٹے موزے بن رہی تھیں۔

"بھیا تم جانتے ہو یہ کس لئے ہیں!" میں سب سمجھتے ہوئے بھی خاموش اور انجان بنا رہا

شاید شاردا نے اسے آج ہی بتایا تھا۔

"آج پہلے "کوالٹی" میں دعوت رہے گی پھر بتاؤں گی"! تم نے نہایت سنجیدہ بنتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا بابا تمہاری دعوت منظور۔ کچھ بتاؤ گی بھی کہ نہیں"۔

"بھیّا اب آپ ڈیڈی بنیں گے"! میں مسکرایا۔

تم نے شاردا کی زچگی کے عرصہ کے دوران میں جس پیار اور محبت سے اس کی دیکھ بھال کی۔ میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔

تم نے اب بڑے بوڑھوں کی طرح گھر کو سنبھال لیا تھا۔ تم شاردا کی دوا اور خوراک کا پورا خیال رکھتیں۔ صبح ذرا دیر سے اٹھنے کی عادت ہونے پر بھی تم اب صبح سویرے اٹھتیں اور شاردا کو صبح شام سیر کے لئے لے جاتیں، میں کبھی ساتھ ہوتا کبھی نہ ہوتا۔

اب اگر بنگلور والے بھائی صاحب اور بھابی تمہیں دیکھ لیتے تو شاید انہیں تمہیں اتنا بدلا دیکھ کر بیحد اچنبھا ہوتا۔

اور جس روز اشوک پیدا ہوا۔ تم بیحد خوش تھیں۔ اب تم ہی اسے نہلاتیں، پوڈر لگاتیں کپڑے پہناتیں۔ اس سے گھنٹوں بے معنی باتیں کرتیں۔ اگرچہ شاردا نے اشوک کو جنم دیا تھا اسے دودھ پلایا تھا لیکن اصل ماں تو تم تھیں تم اشوک میں اپنے آپ کو بھول گئی تھیں۔

اب اشوک کے نام سے حکم صادر ہوتے اشوک کے لئے آپ نے پالنا ابھی تک کیوں نہیں بنوایا۔ اس کے لئے Pram کب خریدیے گا۔ اسے نئے نئے کھلونے لا دیجئے نا۔ شاردا بھی تمہیں اشوک میں اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر بیحد خوش تھی۔ اس کے خیال میں شادی سے پہلے کی ٹریننگ کا یہ ایک ضروری حصہ تھا۔

اشوک بھی تم سے کس قدر مانوس تھا۔ وہ بھی ہمیشہ "بوا" کی رٹ لگاتا لیکن تم اسے پیار سے "کسم دیدی" کہلوانے پر مجبور کرتیں اور تم مجھ سے اکثر کہتیں "میں بھی تو تمہاری بیٹی سمان ہوں نا بھیا!" اور میں تم سے لاڈ میں آکر کہتا۔ "پگلی ہے تو تو! تو تو میری گڑیا سی بہن ہے!"

اور پھر تم جالندھر چلی گئیں۔ میں جب کبھی جالندھر جاتا تو تم مجھ سے ہمیشہ شکایت کرتیں کہ میں اشوک اور شاردا کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا۔ اور پھر ایک دن میں اشوک کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ اس وقت مشکل سے ڈیڑھ سال کا تھا مجھے گمان تھا کہ وہ شاید تنگ کرے لیکن وہ مسلسل دو دن تمہارے پاس رہا گویا وہ اپنی ماں کے پاس ہی رہا ہو۔ وہ تم سے اتنا گھل مل جو گیا تھا۔

تم نے اپنے بنگلے کو نہایت نفاست سے سجایا ہوا تھا۔ تمہارے دل میں اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ ہم تمہارے پاس رہیں۔ تاکہ تم ان تمام باتوں کا عملی طور پر ثبوت دے سکو جو تم نے ہمارے ساتھ رہ کر سیکھی تھیں۔ تم نے ہم سے کہا تھا کہ تمہیں ان تمام چیزوں کی قدر صحیح طور پر شادی کے بعد معلوم ہوئی تھی۔ تمہارے ساس سسر، نند اور دیور تمہارے پاس تھوڑے تھوڑے عرصہ رہ چکے تھے اور تم ان سب کی نظروں میں ایک مثالی لڑکی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں نے تمہارے اندر کوئی غرور کا جذبہ نہیں پیدا کیا تھا۔ تم اب بھی وہی پرانی کسم تھیں، جس کی وجہ سے ہم سب کا نام اونچا ہوا تھا۔

اور پھر تمہاری تبدیلی سنگرور ہو گئی تمہارا ان دنوں پاؤں بھاری تھا اور شاردا کو تمہاری فکر رہتی تھی۔ ہم نے تمہیں اپنے پاس بلایا بھی لیکن تمہارے پتی نے لکھ بھیجا کہ تمہاری ساس تمہاری دیکھ بھال کریں گی اور پھر تار آیا کہ تمہارے ہاں لڑکا ہوا ہے اور

تم خیریت سے ہو۔ ہم نے فوراً مبارکباد کا تار بھیجا لیکن دو دن بعد ہمیں ایک اور تار ملا جس میں لکھا تھا کہ تمہاری حالت خراب ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے صرف میں ہی شملہ کے لئے روانہ ہو سکا۔

اگلے روز جب میں شملہ پہونچا تو سخت بارش ہو رہی تھی۔ میں سیدھا ہسپتال گیا شملہ کے تمام مقامی رشتہ دار وہاں اکٹھے تھے معلوم ہوا کہ تمھیں سخت بخار کی وجہ سے سرسام ہو گیا ہے اور تم نے اس غنودگی کی حالت میں بھی کئی بار ہم سب کو پوچھا تھا۔ تم شائد جانتی تھیں کہ اب تمہارا آخری وقت آ پہنچا تھا۔

مجھے وہ رات ہرگز ہرگز نہ بھولے گی جب تمھیں ذرا سا ہوش آیا تھا۔ تم اس بیہوشی میں بھی ایک سخت اضطراب و بے چینی کی حالت میں مبتلا تھیں۔ تم بار بار کروٹ لینے کی کوشش کرتیں، تمہارے لب کچھ کہنے کے لئے کھلتے لیکن تم کچھ کہہ نہ پاتیں۔ تمہارے جسم کا داہنی طرف کا حصہ اپنی قوت احساس کھو بیٹھا تھا اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب کہ شام کو ڈاکٹر نے تمہارا معائنہ کرتے ہوئے تمہارے دائیں حصے میں چٹکی لینے کی کوشش کی تھی اور تمہارے جسم میں کوئی تاثر پیدا نہ ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر نے محض ذرا سی نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں تمہاری گرتی ہوئی حالت کی علامت پڑھ لی تھی اس نے یہی عمل جسم کے کئی اور حصوں پر بھی کیا اور پھر اس نے ہم سب کو ظاہری طور پر تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "ابھی کچھ کہنا مشکل ہے لیکن امید ہے کہ حالت جلد ہی سدھر جائے گی۔ میں اسے نیا انجکشن لگا رہی ہوں!"

اور رات کو جب تمھیں ذرا سا ہوش آیا تو ہم سب کے چہروں پر ایک امید کی لہر دوڑ گئی تھی تمہاری ساس نے میرا نام لیتے ہوئے تم سے کہا تھا۔ "دیکھ کسم بھیا آئے ہیں۔"

تمھارے چہرے پر جو درد و کرب کے آثار تھے وہ ایک لمحہ کے لئے نہایت ہلکے ہو گئے تھے اور تم نے ایک جدو جہد کے زیر اثر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا تھا۔

"بھیا تم آگئے!" تمھارے الفاظ اس قدر صاف تو نہ تھے۔ ان میں ایک عجب طرح کی لکنت تھی۔ میں تمھارے سرہانے کے قریب بیٹھ گیا تھا اور تم نے اپنا نحیف سا ہاتھ میری طرف بڑھایا جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"بھیا میں تمھیں ہمیشہ تکلیف دیتی آئی ہوں!"

میں نے کہا تھا۔ "کسم تکلیف کیسی! کبھی اپنوں کی بھی تکلیف ہوتی ہے؟"

تم نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور پھر نہایت آہستہ سے کہا تھا۔ "میں سب جانتی ہوں۔ میری اچھی بھابی کہاں ہیں۔ میرا اشوک کہاں ہے! اسے میرے قریب کر دو۔"

میں اس آخری سوال پر چونک گیا تھا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں تمھارے جذبات کی گہرائیوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا تمھاری ساس نے تمھاری موندی ہوئی آنکھوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاس بے بی کوٹ میں لیٹے ہوئے تمھارے بچے کو تمھارے پاس لٹا دیا۔

تم نے غنودگی میں جیسے ذرا سی آنکھیں کھولی تھیں۔ تم نے اپنے بچے کے ماتھے کو تھپتھپاتے ہوئے آخری دعا دی تھی۔ "جگ جگ جیو میرے اشوک!"

تمھارے چہرے پر اب بے حد سکون تھا۔ جیسے تمھیں میرے آنے سے اور اشوک کے مل جانے پر ایک نہایت اطمینان ہو گیا ہو۔ تمھیں وشواس ہو گیا ہو کہ ہم سب تمھارے ساتھ تھے اور اس کے بعد تم نے پھر زندگی بھر آنکھیں نہ کھولیں۔

تمھاری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اگلی شام تک تمھارا سانس اکھڑ گیا۔ تمھیں

آکسیجن دینے کا انتظام کر دیا گیا۔ سارا دن موسلا دھار بارش ہوتی رہی تھی اور رات کو جب اچانک تمہارے بچے کی چیخیں گونجیں تو میری نگاہ آکسیجن سلنڈر کے ساتھ لگی ہوئی اس بوتل پر پڑی جس میں تمہاری آخری سانس کا بلبلہ پانی میں سے اٹھ رہا تھا۔ یہ بلبلہ ایک لمبی دیر تک پانی کے اندر جدوجہد کرتا رہا اور پھر سطح پر آ کر پھٹ گیا۔ بوتل میں اب پانی کی سطح ہموار ہو گئی تھی۔ تم ہم سب کو چھوڑ کر جا چکی تھیں!

ہم تمہیں تمام زندگی میں محبت کے چند خوشگوار لمحوں کے سوا کچھ نہ دے سکے اور تم نے اس محبت کو اتنی شدت سے لوٹایا کہ ہمیں اپنی دی ہوئی محبت تمہاری بے پناہ محبت کے سامنے بالکل حقیر معلوم ہوتی ہے۔ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے تمہاری زبان سے جب آخری لفظ نکلے تو وہ تمہارے اپنے بچی کے لئے نہ تھے جنھیں تم اتنا چاہتی تھیں۔ وہ تمہارے اپنے بچے کے لئے بھی نہ تھے جسے تم نو مہینے اپنی کوکھ میں اٹھائے پھرتی رہیں بلکہ وہ ہمارے شنو کی کیلئے تھے "جگ جگ جیو میرے شنو کی!" یہ سرگوشی میں ڈوبے ہوئے الفاظ آج بھی رات کی تنہائیوں میں مجھے اپنے کانوں میں گونجتے معلوم ہوتے ہیں۔

اور دنیا کہتی ہے کہ میں نے اور تمہاری بھابی نے تمہارے لئے بہت کچھ کیا تھا کتنے کھوکھلے معلوم ہوتے ہیں یہ الفاظ تمہاری ٹھوس اور بے پناہ محبت کے سامنے!

ہم تمہیں کیونکر بھلا سکتے ہیں میری کسم!

چنگاری

دیش کے نیتاؤں کے نام

رات کے اندھیرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی پھر لگاتار بجنے لگی۔ سوتے ہوئے ناگ جی کے کانوں نے بھی نیند سے بوجھل سینوں میں اس گھنٹی کو محسوس کیا تھا پہلی بار انھوں نے صرف بستر پر کروٹ بدلنے پر ہی اکتفا کی تھی لیکن گھنٹی تھی کہ بجے ہی جا رہی تھی۔ اب انھوں نے گھنٹی کی چیختی ہوئی آواز محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں گھنٹی گویا بار بار انھیں تنبیہ کر رہی ہو۔ اٹھیے موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

ناگ جی نے نیند کے عالم میں اپنی چپل کو پیروں سے محسوس کیا اور پھر الٹی چپلیں پہنے ہی آہستہ آہستہ ٹیلیفون کے پاس لگے ہوئے بجلی کے سوئچ کے پاس پہنچے اور اندھیرے میں اسے ٹٹولتے ہوئے روشنی کر دی۔ یکایک روشنی ہو جانے کی وجہ سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ چھت پر سے آتی ہوئی روشنی نے ان کا بے ڈول بھاری بھر کم سایہ کچھ

فرش پر اور کچھ دیوار پر پھیلا دیا۔ ان کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ چار بجنے میں دس منٹ تھے انھوں نے ٹیلیفون اٹھایا۔

"ہیلو۔ میں ناگر بول رہا ہوں!" ان کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا، ایک رچاؤ تھا، ان کے ہر الگ الگ بولے لفظ سے ایک خود اعتمادی جھلکتی تھی، یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ودھان سبھا یا پارٹی کے اجلاسوں میں ان کی ہر تقریر بہایت خاموشی اور پوری دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی۔ وہ پارٹی کے لیڈر تھے لیکن ان کی تمام تر شخصیت ان کے آہستہ آہستہ لیکن پروقار لہجے ہی سے ظاہر ہوتی۔

"ناگر جی! میں تنکل جی کا پی اے بول رہا ہوں۔ بہت شوک سماچار ہے۔ تنکل جی کا ابھی ابھی دیہانت ہو گیا ہے!" تنکل جی پرانتیہ کے مکھ منتری تھے ان کی حالت کئی دنوں سے خراب تھی۔ ناگر جی رات کو بھی دیر تک تنکل جی کے پاس ہی بیٹھے رہے تھے۔ رات کو ۹½ بجے دہلی سے آئے ہوئے کرنل کپاڈیا نے ان کا ڈاکٹری معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ تنکل جی کی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہے لیکن اس کا سارا دارومدار ان کی رات اچھی طرح گزر جانے پر ہے۔

"بھئی یہ اچانک کیسے ہو گیا؟ رات کو تو کرنل کپاڈیا ان کی حالت پہلے سے بہتر بتا رہے تھے"۔ ناگر جی نے الٹی چپلیں ٹھیک سے پہنتے ہوئے کہا۔

"جی کیا بتاؤں۔ تین بجے تک تنکل جی سوتے رہے پھر اچانک ہی انھیں کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کے ساتھ ہی ان کا سانس اکھڑ گیا۔ کرنل کپاڈیا کو ٹیلیفون کیا گیا دوسرے ڈاکٹروں نے انھیں آکسیجن دینا شروع کر دی ساڑھے تین بجے تک کرنل کپاڈیا بھی آ گئے تھے لیکن ان کے آنے کے فوراً بعد ہی ان کے پران چھوٹ گئے۔ ہم سب یتیم ہو گئے ناگر جی!"

"دھیرج رکھو کرپا زائن - یہ آپتی سارے دیش کی ہے! تنکل جی نے اپنا سارا جیون دیش کو ارپن کر دیا تھا!" ان کی آواز میں بے حد دکھ تھا۔ "تم نے پردھان منتری جی کو اور پارٹی کے پردھان کو بھی ٹیلیفون کر دیا ہے نا۔ کیا کہا وہ پاٹھک جی کر رہے ہیں؟ آپ نے مجھ سے کہا ہوتا اچھا میں ابھی آ رہا ہوں ۔!" اور انھوں نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

چند لمحے پہلے جو ان میں تنکل جی کی موت کی خبر سننے سے ایک دیوار سی ہٹ جانے کا احساس پیدا ہوا تھا، اس نے ان کے اندر مکھیہ منتری بننے کی امید کو گدگدایا تھا لیکن یہ اچانک پاٹھک جی کے ذکر نے انھیں ایک ممکن خطرہ سے آگاہ کیا تھا۔ کرپا زائن نے انھیں پہلے ٹیلیفون کیوں نہیں کیا؟ شائد کیا ہوگا! کچھ ایسے جان توڑا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پہلے ہی بجی تھی لیکن ان کی آنکھ رات کو دیر سے سونے کے کارن کھل نہیں پائی۔ شائد اسی لئے کرپا زائن نے پاٹھک جی کو فون کر دیا۔ اچھا ہوتا اگر وہ تنکل جی کی موت کا سماچار خود پردھان منتری اور پارٹی کے پردھان کو دیتے۔

وہ جلدی سے تیار ہونے لگے۔ ان کا دماغ اس دوران میں کچھ عجب ادھیڑبن میں لگا رہا۔ اب تنکل جی کے چلے جانے کے بعد ان کے مکھیہ منتری بننے کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ تنکل جی کا پارٹی کی کیندریہ ورکنگ کمیٹی میں ایک بہت اونچا استھان تھا۔ وہ دیش کے پرانے نیتاؤں میں سے تھے جنھوں نے سوتنتر سنگرام میں مکھیہ بھاگ لیا تھا اسی لئے انھیں تمام نیتاؤں اور منتریوں کا سہیوگ حاصل تھا۔ ان کا کہا کوئی کیوں کر ٹال سکتا تھا پرانتیہ کے ہر کام کو وہ کیندریہ سے چٹکیوں میں کرا کرے آتے جہاں دوسرے پرانتوں کے مکھیہ منتریوں کو مہینوں کوششیں کرنا پڑتیں وہ جنتا میں گنتے پریہ تھے۔ وہ پردھان

منتری کی طرح ہی سوتنتر تا سے ہے کر مرتے وقت تک پرا منیہ کے مکھیہ منتری کی گدی سنبھالے رہے جب کہ دوسرے پرانتوں میں ہر چناؤ کے بعد بلکہ اس کے مدھیہ یگ میں بھی مکھیہ منتری بدلتے رہے ناگر جی خود شکل جی کے داہنے ہاتھ تھے۔ کٹم قبیلہ نہ ہونے کے کارن ان کا سارا دھیان پارٹی کے کاموں میں لگا رہتا تھا۔ انھوں نے ہر چناؤ میں اپنی جان تک لڑا دی تھی اور اسی کارن وہ پارٹی کے پردھان بھی بنائے گئے تھے۔

لیکن ادھر کچھ عرصہ سے پاٹھک جی بھی اپنے پاؤں پھیلا رہے تھے۔ جب سے وہ گر بیہ منتری بنے تھے تب سے وہ ہائی کمانڈ کی نظروں پر چڑھ گئے تھے۔ ان کا ماتھا تو اسی روز ٹھنکا تھا جب کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ مئی میں کیندریہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں خاص طور پر نمنترت کئے گئے تھے لیکن اس وقت انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کو چونکہ دیش کی گر بیہ سمتھتی کے بارے میں چند مشورے کرنے تھے اس کارن وہ شاید اسی ارادے سے بلائے گئے تھے اور یہ بات اچت بھی پرتیت ہوتی تھی کیونکہ پاٹھک جی نے جس پرکار سامپردائک اندولن کو دبایا تھا وہ واستو میں ہی کوئی کوئی کر سکتا تھا۔ ناگر جی کو تو ان دنوں خطرہ ہونے لگا تھا کہ کہیں اس اندولن میں ان کے چھپے ہوئے ہاتھ کا بھانڈا ہی نہ پھوٹ جائے۔ وراصل یہ اندولن بھی ایک حد تک پاٹھک جی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے کے لئے ہی کیا گیا تھا ان سب کے کارن اگر مکھیہ منتری بننے کے راستے میں کوئی کانٹا تھا تو وہ پاٹھک جی ہی ہو سکتے تھے۔ پاٹھک جی شکل جی کو بہت ہی پریہ تھے کیوں کہ ان کے کارن شکل جی کا سر بھی بہت جگہ اونچا ہوا تھا اور اب وہ ودھان سبھا کے ممبروں میں کافی لوک پریہ ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن چناؤ کے موقعوں پر کون کام آتا ہے یہ بھی نیچے سے لے کر اوپر تک سبھی کو معلوم تھا اسی کارن پاٹھک جی بھی انھیں اپنا "گورو" مانتے تھے۔

ناگر جی جب کھدر کے اجلے کپڑے پہن کر باہر آنے لگے تو خوابگاہ کے کمرے میں لگے ہوئے شیشے کے پاس آکر ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھک گئے گویا شیشہ ان کا راستہ روک کر کہہ رہا ہو۔ یہ ہیں نئے مکھیہ منتری۔ کمرے کے کونے میں لگی ہوئی روشنی میں ان کا سایہ بھی نہایت لمبا ہو گیا تھا۔ ناگر جی کا چہرہ ایک انوکھی مسکان سے کھل اٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئے۔ باہر آکر انھوں نے گیراج سے موٹر نکالی اور کار اسٹارٹ کرتے ہوئے انھیں ایکدم خیال آیا کہ دو چار روز بعد ہی وہ خود کار چلانے کے بجائے کسی نئی خوشنما کار کی پچھلی سیٹ پر اخبار پڑھتے بیٹھے ہوں گے اور ان کی سیٹ پر ایک چست وردی میں ملبوس کوئی شوفر ہوگا۔

وہ شہر کے اندرونی حصے میں رہتے تھے اور یہ خیال بھی کہ انھیں جلد ہی مکھیہ منتری کے بنگلے میں اٹھ جانا ہوگا۔ ان کی روح کو ایک عجیب تسکین دے رہا تھا۔

جب وہ تنگل جی کے بنگلے پر پہنچے تو انھیں یہ جان کر نہایت خوشی ہوئی کہ وہ شہر بھر میں پہلے پر سودھ آدمی تھے جو مکھیہ منتری کی مرتیو پر پہنچے تھے۔ ابھی وہ کار سے اترے ہی تھے کہ پریس والوں نے انھیں گھیر لیا۔ ان سے اس مہان درگھٹنا کے بارے میں اور تنگل جی کے جیون چرتر کے بارے میں کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے رکتے رکتے نہایت ناپ تول کے انداز میں کہا تھا۔

"میں نے جب سے یہ شوک سماچار سنا ہے میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا میرے لئے یہ وشواس کرنا کہ تنگل جی اس دنیا میں نہیں رہے۔ اسمبھو ہے۔ تنگل جی کے بارے میں کچھ بھی کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے!"

اتنا کہنے کے بعد وہ اندر برآمدے میں چلے گئے جہاں تنگل جی کا مردہ جسم عین

درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف ان کے عزیز و اقارب بیٹھے ہوئے تھے، خاموش غمگین۔ کہیں کہیں کسی کے سسکیاں لینے کی آواز آ رہی تھی۔ تنکل جی کی بیوی عرصہ ہوا مر چکی تھیں۔ ان کے لڑکے لڑکیاں بھی بیاہے جا چکے تھے۔ بیماری کی خبر سن کر ان کا سارا پریوار اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس پریوار میں ان کے کچھ جانے پہچانے چہرے تھے اور کچھ نئے۔ انھوں نے سسکیاں لیتی ہوئی ایک عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ــ "بہن جی، جو ہونا تھا ہو گیا۔ آپ کو تو اس بات پر گورو ہونا چاہئے کہ آپ کے پریوار کے تنکل جی نے دیش سیوا میں اپنی آہوتی دی۔ ایسا نصیب تو کسی کسی کو ہی ملتا ہے!" اور پھر وہ تنکل جی کے لڑکوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور انھیں دلاسا دیتے ہوئے مردہ جسم کے پاؤں کے قریب فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئے۔

تنکل جی کا جسم سینہ تک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے سر کے دونوں طرف اگربتی اور لوبان جل رہا تھا۔ ایک طرف چند عورتیں گیتا کا پاٹھ کر رہی تھیں۔ اب اجالا ہو رہا تھا آنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اور تنکل جی کا مردہ جسم آہستہ آہستہ پھولوں اور ہاروں سے ڈھکتا جا رہا تھا آنے والے تنکل جی کو شردھا انجلی پیش کر کے بڑی نمرتا سے ناگر جی کو نمسکار کرتے۔ شاید طلوع ہونے والا سورج ڈوبتے ہوئے سورج سے زیادہ کشش رکھتا ہے!

ناگر جی سوچ رہے تھے کہ تنکل جی اپنی زندگی میں ہمیشہ پھولوں سے لدے رہے کتنا جلالی تھا ان کے کیریکٹر! ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی۔ ان کا ہر فیصلہ نپا تلا لیکن اٹل ہوتا۔ اس موت میں بھی ایک عجب وقار تھا! وہی رعب، وہی دبدبہ! وہ سفید مونچھیں جیسے ابھی ان کے ہونٹوں سے ہلنے لگیں گی،

ان کی آواز جیسے پل بھر میں کوٹھی میں گونج جائے گی۔ اس آواز کے سامنے کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یکایک کوئی خیال ناگرجی کے دماغ میں لہرایا۔ کیا شکل جی ان کے دل کی خواہش کو جانتے تھے؟ کیا انھیں معلوم تھا کہ پچھلے دنوں کا سا سپنوا ایک اندولن بھی اسی خواہش کی ایک کڑی تھی اور ناگرجی کو شکل جی کے چہرے پر پھیلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ سے ایسے معلوم ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتے تھے۔ لیکن اگر وہ جانتے بھی تھے تو وہ اب اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے!

یکایک ناگرجی کے دماغ میں کئی اور خیالات آنے لگے۔ انھیں پرانیتہ پارٹی کے پردھان ہونے کی حیثیت سے پارٹی کی طرف سے شکل جی کو شردھانجلی پیش کرنی تھی انھیں نئے بننے والے مکھیہ منتری کے ناطے سے پتہ کرنا چاہیے تھا کہ گورنر، چیف جسٹس انسپکٹر جنرل پولیس اور پرانیتہ کے دوسرے افسران کو اطلاع دی گئی یا نہیں۔ انھیں پھر ارتھی کے جلوس کے رستے میں سرکاری سوگ کے سلسلے میں اور دوسرے انتظامات کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جا کر کسی سے کرپا نرائن کو بلانے کے لئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کرپا نرائن اور چیف سکریٹری دونوں آگئے۔ بہت دیر تک ان سے ضروری صلاح مشورے ہوتے رہے۔ پھر ناگرجی نے پارٹی کے سکریٹری اور دوسرے ساتھیوں سے ٹیلیفون پر بات چیت کی۔ اتنے میں پاٹھک جی بھی اپنی چھڑی ٹیکتے آگئے۔ انھوں نے آتے ہی ناگرجی کو نہایت نمرتا سے نمسکار کیا۔ ان کے ساتھ دو ایک منتری پہلے سے ہی تھے۔ ناگرجی کو افسران اور دوسرے منتریوں وغیرہ کے رویے سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پہلے ہی سے انھیں مکھیہ منتری سوئیکار کر چکے ہوں۔ ناگرجی دل

ہی دل میں خوش تھے۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ گورنر صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ناگر جی گورنر صاحب کو لینے کے لئے آگے بڑھے۔ گورنر صاحب نے نمسکار کرنے کے بعد نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا۔ ناگر جی سے ہاتھ ملا چکنے کے بعد گورنر صاحب کا ہاتھ ایک دوسری طرف بڑھا اب پاٹھک جی ان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

ناگر جی گورنر صاحب کو اندر پہنچانے کے بعد پھر باہر آ گئے۔ لوگوں کی بھیڑ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کی ایک لمبی لائن جو کہ گیٹ سے باہر تک دکھائی دے رہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ تنکل جی کے انتم درشن کرنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ ایک دوسری طرف سے ہائیکورٹ کے جج، یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ایم ال اے صاحبان اور دیگر ممتاز لوگ لائن لگائے پھولوں کے ہار اور بڑے بڑے گوندھے ہوئے ہاروں کے چھلے بطور عقیدت لئے ارتھی کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔

اتنے میں سنہا جی نے جو پارٹی کی اکزیکیٹو EXECUTIVE کے ممبر بھی تھے اور ام ال اے بھی۔ اخبار کا تازہ سپلیمنٹ ناگر جی کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش کر دیا "ناگر جی اب کچھ ہمارا بھی خیال رکھنا"۔

ناگر جی نے ایک لمحہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے دوہرے کئے ہوئے سپلیمنٹ پر ایک نگاہ ڈالی آدھے صفحے میں سیاہ کالے حاشیے کے درمیان تنکل جی کی موت کی خبر اور ان کا جیون چرتر تھا۔ پھر انھوں نے جلدی سے اس کالم پر نگاہ ڈالی جس میں اس موت پر چند لیڈروں کے فوری تاثرات بھی تھے۔ ان کی نظریں موٹے ٹائپ میں چھپے ہوئے ان کے صبح کے انٹرویو والے الفاظ پر آ کر جم گئیں جو اس کالم کی پیشانی

پہ چمک رہے تھے، ناگر جی کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکان آئی جیسے وہ اس خبر کو پڑھ کر نہایت خوش ہوئے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اخبار کے ایڈیٹر اچاریہ جی بخوبی سمجھتے تھے کہ نیا ابھرنے والا سورج کون ہے؟

لیکن اس کے فوراً بعد ہی جب انھوں نے دوہرے کئے ہوئے سپلیمنٹ کا دوسرا حصہ دیکھنے کے لئے پلٹا تو ان کا دل دھک سے بیٹھ گیا ایک طرف ان کا فوٹو تھا تو دوسری طرف پاٹھک جی کی تصویر بھی چھپی تھی اور ان دونوں کے درمیان نہایت جلی حروف میں لکھا تھا "چیف منسٹر کی گدی کے دو حقدار!"

ایک لمحے کے لئے یہ حروف ان کی آنکھوں میں دھندلے ہو گئے۔ انھوں نے جلدی سے جیب میں سے عینک نکالی اور ہر حرف کو نہایت غور سے پڑھنے لگے۔ ان کی تصویر کے نیچے ان کی خدمات کا ذکر تھا اور ادھر پاٹھک جی کے فوٹو کے نیچے ان کی خدمات کا، اور آخر میں ان دونوں تصویروں کے نیچے لکھی ہوئی ترتیب سے الگ موٹے ٹائپ میں ایک جملہ لکھا ہوا تھا "دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"

یکایک ناگر جی کو دھیان آیا کہ سنہا جی انھیں نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے کے جذبات کو سرد مہری کا لبادہ پہناتے ہوئے عینک کو کیس میں بند کرتے ہوئے کہا۔ "سنہا جی یہ تو آپ کے ساتھیوں پر نربھر ہے!"

یہ الفاظ اتنے ہی پر اسرار لیکن پر معنی تھے جتنا کہ سنہا جی کا سوال۔

"ناگر جی۔ ہم لوگ تو آپ کے ساتھ ہیں"

ناگر جی نے دل ہی دل میں سنہا صاحب کے ساتھیوں کا حساب لگاتے ہوئے کہا "دھنیہ واد سنہا جی!"

" اجی ان کو تو میں سنا ہی دوں گا ۔ جیوتی بابو، بینی پرشاد اور سیٹھ صاحب کے ساتھی تو آپ کے ساتھ ہیں ہی!"

ناگر جی ان ناموں کا ذکر آتے ہی دل ہی دل میں ان کی طاقت کا حساب لگانے میں لگ گئے ۔

" لیکن ہاں سری واستو جی ، گوری بابو اور اسلم صاحب ہیں جن کے بارے میں نشچے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا!" سنہا جی نے مزید معلومات دیتے ہوئے کہا ۔

"ہاں ان کالیتھوں اور مسلمانوں کو بھی دیکھ لیں گے!" ناگر جی نے مسکراتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا

" اب رہ گئے کنور سورج پرشاد اور نگم جی! خیر نگم جی کے لئے تو میں کیندریہ کے منتری اپادھیہ جی سے ٹیلیفون کروا دوں گا وہ تو ان کی مٹھی میں ہیں ۔ ہاں کنور جی ہیں ۔ دیکھیں یہ کیا چاہتے ہیں؟" اور پھر وہ رکتے ہوئے بولے ۔

" سنہا جی کیندریہ کے راجیندرن جی اور چیٹرجی کے کانوں سے بھی تو نکال لو ۔ آجکل یہی لوگ تو ہیں جو ہائی کمانڈ پر اپنا جادو جگائے بیٹھے ہیں! چیٹرجی سے تو تمہاری کافی چھنتی ہے تمہارے سمبندھی بھی تو ہیں ۔ ذرا کرو نا ان سے بات! اپادھیہ جی تو ہمیں SUPPORT کریں گے ہی اب ذرا راجیندرن جی تھوڑی ٹیڑھی کھیر ہیں!"

" ہاں وہی تو پاٹھک جی کو بہت چاہتے ہیں ۔ جب پوچھتا ہوں کیا لعل لگے ہیں پاٹھک جی میں اور ناگر جی کیندریہ کے کنور رتن جی کو مت بھولیئے بہت گرو آدمی ہیں ۔ ہائی کمانڈ ان کی بہت سنتے ہیں ۔"

" ہاں بھائی کیوں نہیں ۔ پارٹی کو نقد نارائن بھی تو چاہیئے ۔ خیر ان کا راجہ سنگرام گڑھ

دو ادارہ انتظام کریں گے۔ آخر کنور جی کی لڑکی راجہ صاحب کے گھر ہے!"

"سہاجی"۔ ناگر جی ہنستے ہوئے بولے "ہم بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے!"

اور پھر ایک دم ان کے چہروں پہ ہنسی منجمد ہو کر رہ گئی۔ پورٹیکو میں ایک گورنمنٹ کار رکی اور اس میں سے پہلے سری واستو اجی اور پھر کیندریہ کے گرہیہ منتری شری رامچندرن جی۔ پاٹھک جی بھیڑ میں سے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔

رامچندرن جی کے آنے کا خیال تو ناگر جی کو آیا بھی نہ تھا۔ وہ شاید ابھی ہوائی جہاز سے اترے ہوں گے۔ بھلا دہلی سے آنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے! پاٹھک جی نے صبح سویرے انھیں بھی ضرور ٹیلیفون کیا ہو گا! ناگر جی یہی سوچتے ہوئے رامچندرن جی کی طرف بڑھ گئے جہاں وہ نہایت نمرتا سے سب کو نمسکار کر رہے تھے۔ ناگر جی نے آگے بڑھ کر رامچندرن جی کو نہایت جھک کر نمسکار کیا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے اور پھر وہ ایک طرف پاٹھک جی کی کمر پر ہاتھ دھر کر اور دوسری طرف ناگر جی کا سہارا لیے آگے بڑھے۔ ناگر جی کو رامچندرن جی کا یہ انداز بہت بھلا لگا۔ لوگوں کی بھیڑ ان کو راستہ دینے کے لئے چھٹ گئی۔

شکل جی کی ارتھی کا جلوس نہایت دھوم دھام سے نکلا۔ ارتھی ایک فوجی گاڑی پر رکھی گئی تھی اور اسے پھولوں اور ہاروں سے سجایا گیا تھا۔ ہزاروں کی بھیڑ ارتھی کے ساتھ تھی۔ ارتھی والی گاڑی پر شکل جی کا لڑکا، ناگر جی، پاٹھک جی اور رامچندرن جی بیٹھے تھے۔ ہجوم شکل جی کے بارے میں نعرے لگا رہا تھا۔ ادھر رام دھن جاری تھی۔ جا بجا بلڈنگوں پہ قومی جھنڈا سرنگوں لہرا رہا تھا۔ تمام راستہ میں پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ ناگر جی اپنی ہی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ موت کس طرح راستے ہموار کر دیتی ہے۔

شام تک پتہ چل گیا کہ نئے منتری منڈل سنبھالنے کئے جانے کے بارے میں پارٹی کے جلسے

میں ہائی کمانڈ کی طرف سے راجیندر جی نمائندگی کریں گے۔ نئے مکھیہ منتری کا چناؤ ایک خفیہ بیلٹ سے طے ہونا قرار پایا تھا اور یہ سبھا تیسرے دن کے لئے رکھی گئی تھی۔

ان چالیس گھنٹوں میں ٹیلیفون کی گھنٹیاں متواتر ودھان سبھا کے ممبروں کے گھروں میں بجتی رہیں۔ طرفین سے منصوبے باندھے جاتے رہے منتری منڈل کے عہدے کئی لوگوں میں بانٹے جاتے رہے۔ منتری منڈل کی تعداد بڑھانے گھٹانے کے بارے میں کتنے منتری کیبنٹ میں ہوں گے۔ کتنے منسٹر آف اسٹیٹ، کتنے ڈپٹی منسٹر اور کتنے پارلیمنٹری سکریٹری ہوں۔ مشورے ہوتے رہے۔ جیسے کوئی لوٹ تھی جو کئی بار تقسیم ہوئی۔ کتنے ہی لوگ خیالوں میں پارلیمنٹری سکریٹری سے ڈپٹی منسٹر، ڈپٹی منسٹر سے منسٹر آف اسٹیٹ اور کیبنٹ منسٹر بن گئے۔ چند ایک نے تو کوٹھیوں کے بارے میں بھی اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ راجیندر جی کے دروازے پر دونوں گروپوں کے نمائندوں کی بھیڑیں اکٹھی ہوتی رہیں۔ لیکن راجیندر جی نے نہایت انکساری سے دونوں فریقین سے کہہ دیا کہ مکھیہ منتری کا فیصلہ تو آپ لوگوں ہی کو کرنا ہے۔ کہیں سے یہ سننے میں ملا کہ تنکل جی نے اپنا جانشین پاٹھک جی کو ہی مقرر کیا تھا اور جس کا ذکر انھوں نے ہائی کمانڈ اور راجیندر جی سے بھی کیا تھا۔ دوسرے گروپ کی طرف سے یہ کہا جا رہا تھا کہ مکھیہ منتری وہ ہونا چاہیئے جو پارٹی کو جنتا کے قریب لے جائے اور اس کارن اس پد کے یوگیہ کیول ناگر جی تھے۔ جو لوگ کسی وجہ سے شہر میں نہ تھے انھیں ٹیلیفون کر کے یا تار دے کر ان کے شہروں اور گاؤں سے بلا لیا گیا۔

میٹنگ ہونے سے پہلے تک سرگوشیوں میں، اشاروں میں، دبی زبان سے ناگر جی اور پاٹھک جی کا چرچا ہوتا رہا۔ میٹنگ ودھان سبھا کے ہال میں تھی۔ پاٹھک جی خود اپنی کار

میں پانچ چھ ایم۔ ایل۔ اے کو بٹھا کر لائے تھے۔ ناگر جی کے ساتھی بھی اس معاملہ میں کچھ کم نہ تھے۔ انھوں نے بھی اس سلسلے میں کئی کاروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ناگر جی جب پاٹھک جی سے سیڑھیوں پر ملے تو انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے لیکن نہایت گرمجوشی سے ایک دوسرے کا سواگت کیا اتنے میں رامچندرن جی کی کار آ گئی اور دونوں مل کر نہایت عزت وتپاک سے انھیں اندر لے گئے۔

ہال میں سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پاٹھک جی بیچ والے راستہ کے بائیں طرف پہلی قطار میں بیٹھ گئے۔ رامچندرن جی نے سامنے والا میز سنبھال لیا۔ ان کے اٹھتے ہی کمرے میں ایکدم خاموشی چھا گئی۔ رامچندرن جی نے شکل جی کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس چناؤ کی اہمیت کو جتایا۔ اور پھر اس کے بعد انھوں نے اس چناؤ کے قواعد سے آگاہ کیا اس کے بعد ناگر جی اور پاٹھک جی کے نام ان کے ساتھیوں نے پیش کئے۔ ان ناموں کا اعلان کرنے کے بعد رامچندرن جی نے ممبر صاحبان کو چناؤ کی پرچیاں جاری کرنی شروع کیں۔ ہر شخص کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ایک طرف لگے ہوئے اسکرین کے پیچھے جاکر پرچی پر حسب منشا نام کے آگے نشان لگا کر میز پر پڑے ہوئے بکس میں ڈال دے۔

فضا میں ایک عجب خاموشی تھی جس میں کبھی کبھی کوئی سرگوشی سنائی دے جاتی۔ پاٹھک جی نہایت خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کے ہتھے سے کھیل رہے تھے ناگر جی بظاہر کوئی رپورٹ پڑھ رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں ہر ووٹ ڈال کر آنے والے کے چہرے کا جائزہ لیتیں۔ کئی ممبر تو اس خیال سے کہ ان کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو اس طرح کا سنجیدہ منھ بنا کر باہر نکلتے

گویا وہ کسی عزیز کو دفن کرکے آ رہے ہوں، کچھ کے چہرے اس طرح کھلی کتاب کی طرح ہوتے جیسے وہ کسی سرکس کے رنگ ماسٹر کے اشارہ کے مطابق کام کرنے کے بعد اس سے داد طلب کر رہے ہوں۔ کچھ چہرے ایسے بھی تھے جو یا زمین میں یا چھت پر گڑے ہوتے تاکہ کوئی ان کے بارے میں کسی قسم کا شبہہ نہ کر سکے۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد ووٹ گنی جانے لگیں، فضا میں گویا کھنچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ناگر جی کے عین سر پر ایک بجلی کا لیمپ لٹک رہا تھا جو پنکھے کی ہوا میں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ روشنی کا یہ دھبہ ان کے وجود کو ایک عجب طرح سے اجاگر کر رہا تھا جیسے اسٹیج پر کسی اہم کردار پر روشنی ڈالی جا رہی ہو۔ ناگر جی اب عینک اتار کر صاف کرنے لگ گئے۔ ان کی آنکھیں اب نہایت تیزی سے جھپک رہی تھیں۔ پاٹھک جی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کے دستے کو اب تیزی سے گھما رہے تھے۔

ووٹ گننے کے بعد جب نتیجہ راجندرن کے سامنے لایا گیا تو سب کی نظریں ان پر گڑ گئیں۔ راجندرن جی نے ووٹ گننے والے شخص سے سرگوشانہ لہجہ میں کچھ پوچھا اور پھر دونوں نے سر ہلا دیا۔ راجندرن جی نتیجے کا اعلان کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دو سو پچانوے ووٹوں میں پندرہ ووٹ ایسی شامل ہیں جو کہ قاعدہ کے مطابق ٹھیک نشان نہ لگنے کی وجہ سے رد کرنی پڑی ہیں باقی دو سو اسّی ووٹوں میں ناگر جی کے حق میں ایک سو چھبیس ووٹ ہیں اور پاٹھک جی کے حق میں ایک سو چودن اس لیے ......" اور راجندرن جی کی آواز شور و غل

میں کھو گئی۔ جیسے ایک دم ہال زندہ ہو گیا ہو اور کئی آوازیں تیزی سے گونج اٹھی ہوں۔

"پاٹھک جی کی جے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے! ناگر جی۔"

"نئے مکھیہ منتری کی جے۔"

"ناگر جی نئے مکھیہ منتری۔"

اور ناگر جی کو ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ گویا ان کے سر پر جھولتا ہوا لیمپ بھی رک گیا ہو۔

"خاموش ہو جائیے پلیز — خاموش ہو جائیے"۔ راجیندرن جی نے میز تھپتھپاتے ہوئے کہا — "ساتھیو! آپ کو نیا مکھیہ منتری مبارک ہو۔ میں چاہوں گا کہ ناگر جی سب سے پہلے پاٹھک جی کو مبارک باد پیش کریں۔"

ناگر جی اس غیر متوقع فرمائش کے لئے بالکل تیار نہ تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو پھر بہت جلدی سنبھال لیا وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عین سر پر لگے ہوئے لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ نہایت سکڑ کر رہ گیا۔

"ساتھیو! آج کا دن ہمارے پردیش کے لئے بہت شبھ دن ہے۔ میں اپنے متر اور نئے مکھیہ منتری پاٹھک جی کو ہاردک بدھائی دیتا ہوں — پاٹھک جی کی جے —!" اور اس کے ساتھ فضا میں کئی اور آوازیں گونج اٹھیں۔

اور ایسا معلوم ہوا جیسے سلگتی ہوئی چنگاری ایک لمحہ کے لئے مدّھم پڑ گئی ہو —— اور دوبارہ سلگنے کے لئے ہوا کے کسی اور جھونکے کا انتظار کرنے لگ گئی ہو۔

تیس سال پہلے

منظر سلیم کے نام

یہ رات کس قدر بھیانک ہے! بجلیوں کے کوندے بادلوں کے چنگھاڑنے کی ڈراونی آوازوں کے درمیان آسمان کی وسعتوں پر اس کونے سے اس کونے تک پلک بھر میں پھیل جاتے ہیں! ہوا کے تند جھونکے گویا ان توی ہیکل درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیں گے۔ میں نے تمام کھڑکیاں، دروازے بند کر دیے ہیں لیکن ہوا کے جھونکے دروازوں میں سے بھی آ کر لٹکے ہوئے پردوں کو پھڑپھڑا رہے ہیں۔ بارش ٹین کے سائبانوں پر ایک مسلسل دل دہلا دینے والا شور کر رہی ہے ـــــ بالکل ویسی ہی ہولناک رات ہے جیسی تیس سال پہلے ـ!

میں آج اس ویران جگہ پر کیوں لوٹ آیا ہوں جہاں میں نے کبھی نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ جگہ اب بدل چکی ہوگی لیکن یہ بالکل ویسے ہی ہے۔ ڈاک بنگلہ میں لگے ہوئے سفیدہ کے اونچے اونچے درخت جوں کے توں کھڑے ہیں ڈاک بنگلہ کے عقب میں درختوں کے جھنڈ سے گھری ہوئی جھیل میں اسی شدت سے لہریں اٹھتی

ہیں اور وہ اسی طرح پھیل پھیل کر درختوں کے پراسرار سایوں سے ٹکراتی ہیں۔ ڈاک بنگلہ کے داہنی طرف دور پہاڑیوں کا زینہ بہ زینہ سلسلہ اسی طرح سے مہیب اور پراسرار دکھلائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ باورچی خانہ کی کھلی کھڑکی بھی ان تیز ہواؤں میں ویسے ہی چرچراتی ہے جیسے تیس سال پہلے!

لیکن ان تیس برسوں کے دوران میں اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی! بھڑکتی اور دہکتے ولولے زمانہ کی چوٹیں کھا کھا کے سرد ہو چکے ہیں۔ میں نے ہمیشہ سمجھا تھا کہ دنیا ہے تو عورت کی گود میں۔ عقبیٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں! آج جیسا بھڑکا ہوا موسم میرے جذبات میں ایک ہیجان برپا کر دیتا۔ اسی لیے مجھے یہ جگہ بے حد پسند تھی —— بے حد! بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک مجھے ایک عجیب تسکین بخشتی۔ ٹین کی چھت پر زور زور سے بارش یا ژالہ باری کی آواز میرے لئے موسیقی کا کام دیتی۔ میری نگاہ میں اس ہر چیز کے لئے حقارت تھی جو کمزور، لاغر اور بے بس ہوتی۔ میرے نزدیک زندگی کی کشمکش محض طاقت اور صرف طاقت سے جیتی جا سکتی تھی!

باہر بارش قدرے دھیمی ہو گئی ہے لیکن ہوا اب بھی درختوں میں سے سیٹیاں بجا رہی ہے۔ ڈاک بنگلہ کا کھلا ہوا پھاٹک زور زور سے متواتر بج رہا ہے۔ ٹھک —— ٹھا، ٹھک —— ٹھا ٹھک —— ٹھا۔ شاید چوکیدار اسے بند کرنا بھول گیا ہے، وہ بچارا اپنے کوارٹر کے کسی کونے میں سردی سے ٹھٹھرتا دبکا پڑا ہوگا —— ارے یہ کیا! یہ آواز سنی تم نے! ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹا سا بچہ زور زور سے رو رہا ہے۔ روئے چلا جا رہا ہے۔ یہاں آس پاس کوئی بچہ بھی تو نہیں ہے! پھر یہ آواز کس کی ہے؟ یہ آواز مدھم کیوں ہو گئی؟ مدھم کیوں ہو گئی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹ کر رہ گئی ہو۔ اوہ خدا! یہ کیا؟ میرے سارے جسم میں کپکپی

کیوں پیدا ہوگئی ؟ مجھے یہ ٹھنڈا پسینہ کیوں آگیا ؟ میرا رواں رواں کیوں خوف سے کانپ رہا ہے؟

اوہ ! یہ پھر وہی رونے کی آواز ! یہ تو رجو کی جانی پہچانی آواز معلوم ہوتی ہے ! ہاں ہاں

وہی تو ہے ! بالکل وہی ! آج تیس سال کے بعد پھر وہی آواز کیوں ؟ میرے گناہوں کی بازگشت

میں نے اس لمبے عرصہ میں خود بہت دکھ پائے ہیں - میرا ضمیر خود مجھے لعنت ملامت کرتا رہا ہے

میں تیس سال پہلے ایسی ہی ایک بھیگی ہوئی شام کو ماہ گل کے ساتھ اس کوٹھی میں داخل

ہوا تھا - ہمارے پیچھے پیچھے نوکر رجو کو اٹھائے آرہا تھا - مجھے یہ تصویر آج تک یاد ہے ! ماہ گل

کا کھلکھلاتا چہرہ جو اس جگہ کو دیکھ کر حیرت اور خوشی کے جذبات سے دمک اٹھا تھا رجو کی

چھوٹی سی گھومتی ہوئی گردن جو کہ پھولوں اور تتلیوں کو دیکھنے میں محو تھی ! رجو اس وقت صرف

چھ مہینے کی تھی - تین مہینے پہلے میری بیوی نجمہ ، رجو کو چھوڑ کر اس دنیا سے جا چکی تھی - نجمہ

سے شادی ہوئے صرف تین برس گزرے تھے - مجھے اعتراف ہے کہ ان تین برسوں میں نجمہ

نے کبھی بھی اپنے آپ کو خوشی سے میرے سپرد نہیں کیا تھا اور میں دریا کے کنارے

رہتے ہوئے بھی ہمیشہ تشنہ رہا -- نجمہ شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت اچھی لڑکی

تھی لیکن نجانے کیوں افسردگی اس کی آنکھوں میں سے جھلکتی رہتی - میرے ہاں ہر قسم کی

آسائش اسے میسر تھی - نوکر چاکر ، دولت ، بنگلہ لیکن مجھے گمان تھا کہ وہ ان سب کو

پاکر بھی کسی چیز کی کمی محسوس کرتی تھی - شاید وہ شادی سے پہلے کسی اور سے محبت کرتی

تھی لیکن میں اس قدر قریب رہ کر بھی اس راز کی تہہ کو نہ پا سکا - وہ میرے لئے ہمیشہ

پراسرار رہی - وہ بدن کی کمزور اور چھوئی موئی سی تھی گویا ہاتھ لگانے سے ہی مرجھا

جائے گی اور میرے اندر کا چھپا ہوا مرد کبھی بھی اس سے تسکین نہ پا سکا - مجھے اس کے

مرنے کا افسوس تھا لیکن اس نے اپنی ذات میری ذات میں مدغم ہی کب کی تھی !

اس کے برعکس ماہ گل ایک افغان خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا قد پونے چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی اونچا تھا۔ اس کا جسم نہایت بھرا بھرا تھا۔ اس کی ہڈیاں چوڑی، پشت کشادہ اور کمر نہایت متناسب تھی۔ اس کی بھری بھری زہد شکن گولائیاں اور بیضوی چہرہ نظارۂ حسن تھے۔ جب پہلی بار میں نے اسے سینے سے لگا کر بھینچا تھا تو اس کی شدید گرفت نے میری شدت جذبات پر ایک اور تازیانہ لگایا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ صحیح جنسی زندگی کیا تھی! میں ماہ گل کو پا کر خوش تھا اور وہ مجھے!

ماہ گل کو بھی میری طرح سکون و ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ اسے بھی آندھی، طوفان بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک، چٹانوں کی ٹھوس طاقت اور سمندر کی طوفانی موجوں سے عشق تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ماہ گل کو بھی میرا مرغوب مقام پسند آئے گا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مجھے میرے حوالے کر دے گی۔ سارے راستہ میں ماہ گل ایک مچلتے ہوئے بچے کی طرح مجھے کھینچ کھینچ کر آگے بڑھاتی رہی گویا اسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگنے والا ہو۔ میں بھی ماہ گل کو ایسے ہی رنگ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سلیکس پہنے، بالوں پر رنگین ریشمی رومال باندھے آج بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب کہ عورت کا رواں رواں خوشی سے پھوٹ رہا ہو وہ مجھے کبھی بھگا کر آگے اور کبھی پیچھے درختوں کے جھنڈوں میں لے جاتی اور وہاں اپنے مضبوط بازوؤں میں مجھے بھینچ لیتی۔ آج وہ عاشق تھی اور میں محبوب! مجھے بھی اس چھیڑ چھاڑ میں بہت لطف آ رہا تھا۔

ڈاک بنگلہ پہنچتے ہی نوکروں نے کمروں میں سامان لگانا شروع کر دیا۔ برآمدے

میں کھڑے ہم دونوں غروب ہوتے ہوئے سورج کو پہاڑیوں کے پیچھے چھپتے دیکھتے رہے حتیٰ کہ آسمان کے نارنگی سائے سرمئی اندھیروں میں غرق ہو کر رہ گئے چوکیدار نے شمعدان روشن کر دیے اور کھانے کے کمرے میں میز لگانے کے لیئے چلا گیا۔ ماہ گل نے ایک مستی بھری انگڑائی لی اور پھر اس نے میری طرف پشت کر کے بالوں پر بندھے ہوئے ریشمی رومال کھولنے کے لئے اپنے سر کو میری طرف جھکا دیا۔ میں نے رومال کی گرہ کھول دی اور ایک جھٹکے سے اس کے لمبے لمبے بھیگتے بال اس کے شانوں پر پھیلا دیے اس نے پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ اسے آغوش میں لینے کے لئے بڑھے لیکن وہ ایک ادا سے میرے ہاتھوں میں سے پھسل کر انگوٹھا دکھاتی ہوئی اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ مجھے اس کی یہ ادا اور چڑا دینے والی ہلکی سی ناک کی جنبش آج تک یاد ہے!

تھوڑی دیر بعد آسمان یکایک بادلوں سے گھر گیا۔ زوروں کی بجلی چمکنے لگی۔ اور بادل دہاڑنے لگے۔ کھانا ختم کر چکنے کے بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ماہ گل کی بات بات سے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں وہ ہنستے ہوئے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی اس کی آنکھوں میں ایک شرارت بھری چمک تھی اس نے سیاہ کشمیری ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا جو اس کی سفید جلد پر نہایت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ڈریسنگ گاؤن کے کٹاؤ میں سے اس کے بلوریں جسم کی گولائیاں میرے اندر ہیجان برپا کر رہی تھیں۔ کمرے میں شمعدان کے سائے بھی ایک عجب وفور مسرت سے ناچ رہے تھے۔

رجی کو نوکر نے دودھ پلا کر ساتھ والے چھوٹے کمرے میں سلا دیا تھا۔ ہم نے

ماہ گل سے تاش کھیلنے کی فرمائش کی - وہ خوشی خوشی تیار ہو گئی - اس کی طرف سے یہ شرط تھی کہ جیتنے والا ہارنے والے کے لئے جو شرط تجویز کرے وہ اسے منظور کرنی پڑے گی -

پتے بانٹے گئے پہلی بازی میں ہار گیا - ماہ گل نے مجھے بیس بار پیار کرنے کے لئے کہا - اس انوکھی شرط نے میرے جذبات کو بھڑکا دیا -

اگلی بازی میں جیت گیا - اب میری سزا دینے کی باری تھی میں نے اس سے گاؤن اتارنے کی فرمائش کی - اس نے ایک شرارت بھری نظر سے میری طرف دیکھا - وہ ایک ادا سے اٹھ کر بھاگ گئی - میں اس کے پیچھے لپکا

"اچھا بابا لو — مجھے تمہاری شرط منظور ہے" اس نے مجھ سے کچھ دور جا کر اپنا گاؤن فرش پر گرا دیا - اس کا نیم برہنہ جسم اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے تھا - میرے صبر کے بند ٹوٹ گئے میں نے دوڑ کر اسے اپنی آغوش میں اٹھایا اور اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر پلنگ پر گرا دیا -

میں دیوانہ وار اس سے لپٹ لپٹ کر پیار کر رہا تھا - ماہ گل میں بھی عورت پوری طرح بیدار ہو چکی تھی - دفعتاً بجلی زور سے چمکی اور اس کے ساتھ ہی بادلوں کی ایک لمبی گرج سنائی دی ماہ گل نے ایک خوشی کی چیخ کے ساتھ نہایت شدت سے میرے شانے کو اپنے دانتوں سے کاٹ لیا - عین اس وقت ملحق والے کمرے سے رجی کے بے اختیار رونے کی آواز آئی میرا جسم ایک لمحہ کے لئے ڈھیلا پڑ گیا مجھے رجی کے اس وقت رونے پر سخت غصہ آ رہا تھا -

ماہ گل چلائی - "اس کمبخت کو بھی کیا اسی وقت رونا تھا" وہ غصے سے

جھنجھلا اٹھی۔ رجّی لگاتار روئے جا رہی تھی۔

میں غصہ سے پاگل ہو اٹھا۔ میں بھاگ کر رجی کے کمرے کی طرف گیا وہ منھ پھاڑے چلائے جا رہی تھی میں نے جلدی سے پاس پڑا ہوا تکیہ اٹھا کر اس کے منھ پر رکھ دیا اور تکیے کو دونوں طرف سے زور سے دبا دیا۔ رجی تلملائی، اس کی چیخیں دب گئیں، اور پھر اس کی آواز، ہچکیوں کے درمیان گھٹ کر رہ گئی۔

میں واپس ماہ گل کے پلنگ کی طرف گیا۔ ماہ گل نے پوری شدت کے ساتھ مجھے بھینچ لیا اور ایک جدوجہد کے بعد ماہ گل کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ مجھے پیار کرتی ہوئی بولی۔

"رجّو سو گئی ہے نا ——"

....

اس رات بھی تیز ہوا درختوں کے پتوں میں چھپ چھپ کر سیٹیاں بجاتی رہی۔ ٹین کے سائبان پر بارش اسی طرح سے شور اور ڈاک بنگلہ کا کھلا ہوا پھاٹک متواتر اسی طرح سے بجتا رہا تھا —— ٹھک ٹھا —— ٹھک ٹھا۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو ماہ گل میرے سامنے کھڑی تھی اس کا چہرہ موت کی طرح زرد تھا اس کا اٹھا ہوا ایک ہاتھ رجّو کے کمرے کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور اس کے ہونٹ خالی ہوا میں دیر تک لرزتے رہے اس کی کھلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں یکایک اس نے زور سے چیخ ماری اور پھر وہ ایک دہشت زدہ بچے کی طرح جس نے کوئی آسیب دیکھ لیا ہو موسلا دھار بارش میں ڈاک بنگلہ سے باہر بھاگ گئی۔ میں اسے پکارتا رہا۔ آوازیں دیتا رہا لیکن وہ بے تحاشہ بھاگتی رہی۔

مجھ سے دور، میری زندگی میں پھر کبھی واپس نہ آنے کے لئے!۔

بالکل اس دن کی طرح آج بھی بارش اسی طرح کھڑکیوں پر دستک دے رہی ہے!—— او خدا! یہ کیا؟ پھر وہی رجو کے رونے کی آواز، وہی ہچکیوں کے درمیان گھٹتی ہوئی چیخیں! رجی! رجی تم اس طرح سے تو مجھ سے انتقام نہ لو! اس رات سے میری تمام زندگی ویرانیوں میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ رجی خدا کے لئے مجھے معاف کر دو! رجی اب تو خاموش ہو جاؤ—— خدا کے لئے چپ ہو جاؤ —— چپ ہو جاؤ!

روہتانگ پاس

محمد طفیل کے نام

مجھے منالی پہنچے دو تین روز ہی ہوئے تھے کہ "روہتانگ پاس، روہتانگ پاس کا شور وہاں کی پریشان کن مکھیوں کی طرح میرے کانوں میں بھنبھنانے لگا۔ منالی وادیٔ کلو میں برفانی پہاڑوں کے زیر سایہ ایک نہایت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ اس کے چاروں طرف چیلوں کے اونچے اونچے جھنڈ ہیں جہاں تیز رو چشموں کا پانی ان دیوقد درختوں میں چھن کر آتی ہوئی روشنی میں کسی چاندنی رات میں کھلے ہوئے تاروں کی طرح ہر وقت جھلمل کرتا رہتا ہے۔ شہروں کے شور و غل سے دور ان چیلوں کے درختوں کے سائے تلے ایک عجیب چین و سکون کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس پرسکون خاموشی میں چشموں کا پانی چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکراتا۔ ڈب ڈب۔ ڈب ڈب کی رسیلی آواز پیدا کرتا ہوا بہا چلا جاتا ہے۔ گویا کوئی ساقی خم کے خم لگاتار جاموں میں انڈیلتا چلا جا رہا ہو۔ منالی کی دوسری طرف دریائے بیاس چنگھاڑتا ہوا، للکارتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے۔

دراصل منالی نہایت ہی حسین جگہ ہے۔ وہ لوگ جو لارڈ بائرن کی طرح چنگھاڑتے ہوئے غضیلے تند سمندر، یا تیزی سے موجیں مارتے ہوئے دریا کو پسند کرتے ہیں۔ انھیں یہاں کا نظارہ تسکین مہیا کرتا ہے۔ اور جو لوگ ورڈز ورتھ، شیلے یا کیٹس کی طرح فطرت کے خاموش اور مسحور کن نظاروں کو پسند کرتے ہیں۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں اور چیلوں کے جھنڈ میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے سائے ان کی دل جوئی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اگر ان سب میں کوئی چیز خارج از ترتیب ہے تو وہ ہیں منالی کا گندہ بدبودار بازار اور وہاں کی بھنبھناتی ہوئی پریشان کن مکھیاں۔

ان سے چھٹکارے کا سہل علاج تھا منالی سے فرار اور وہ کسی حد تک روہتانگ پاس اور ایسی ہی دوسری قریبی جگہوں کی صورت میں موجود تھا!

منالی سے روہتانگ پاس کوئی بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر ہے جیپ کا راستہ صرف ڈہلی تک ہے جو کہ منالی سے سات میل کی دوری پر ہے۔ اس کے بعد سخت چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ اکثر لوگ پیدل جاتے ہیں لیکن بعض لوگ منالی سے ہی ڈہلی سے آگے جانے کے لئے گھوڑے کا انتظام کر لیتے ہیں لیکن اس کٹھن کمر توڑ چڑھائی میں اکثر انسان ہی گھوڑے کو کھینچ کرلے جاتا ہے۔

منالی سے ڈہلی تک جانے کے لئے صرف ایک ہی جیپ تھی جس کے مالک تھے لالہ طوطا رام۔ جیپ کے علاوہ ان کے اور بھی کئی دھندے تھے۔ سیب کے باغات تھے۔ پہاڑی آلوؤں کی آڑھت تھی اور پھر ان کے پاس مٹی کے تیل کا ڈپو تھا یہ سب چیزیں سونا اگلتی تھیں اور مجھے حیرانی تھی کہ ڈی ٹیوٹی کنڈم کھٹارا جیپ کے بدلے ان کی جیپ سونے سے کیوں نہ بنی ہوئی تھی!

جیپ کے بارے میں لالہ طوطارام کا رویہ اجارہ دارانہ تھا جیپ میں آٹھ سواریوں کے بجائے وہ ہمیشہ تیرہ چودہ سواریاں بٹھاتے۔ جیپ کے چلنے کا نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ مقام۔ عام طور پر جیپ صبح دو پھیرے لگاتی۔ صبح پانچ بجے اور پھر آٹھ بجے۔ جو لوگ واقعی روہتانگ جانا چاہتے ان کے لئے پہلا ہی پھیرا موزوں رہتا۔ کیوں کہ اس طرح سے وہ ساڑھے چھ سات بجے تک راہلا پہنچ جاتے۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر روہتانگ کے لئے روانہ ہو جاتے۔ یہ پانچ چھ میل کا سفر مشکل سے پانچ چھ گھنٹے میں ہی طے ہو سکتا۔ اس طرح سے بارہ ایک بجے تک ہی واپسی ممکن ہو سکتی تھی۔ آٹھ بجے کی جیپ سے جانے والوں کا مقصد یا تو کوٹھی یا راہلا کے قریب آبشاروں کو دیکھنے کا ہوتا یا وہ محض تفریح کی غرض سے روہتانگ کے راستے کی مشکلات کا اندازہ لگانا چاہتے۔ اس دوسرے پھیرے میں جانے والے اکثر عورتیں، بچے یا ادھیڑ عمر کے لوگ ہی ہوتے۔

میں نے لالہ طوطارام سے اگلی صبح کے لئے سیٹ بک کرانے کے بعد روانگی کا وقت پوچھا تو لالہ طوطارام نے اپنے ہرے رنگ کے مفلر کو گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے ایک بڑا سا ڈکار لیتے ہوئے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں نے کوئی نہایت غیر مناسب یا گستاخانہ سوال پوچھ لیا ہو۔

"میں ابھی سے کیسے بتا سکتا ہوں؟" انھوں نے اپنی کلو کیپ کے سرخ مخملی حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"رات کو نو بجے صبح کو روانگی کے لئے اطلاع دے دی جائے گی!"

"کہاں؟"

"سنو ویو SNOW VIEW اور ڈاک بنگلہ ہیں!"

"لیکن میں تو درگا لاج میں ٹھہرا ہوا ہوں!"

"تو آپ کو ان دونوں جگہوں میں سے یا یہاں آکر دوکان سے پتہ کرنا پڑے گا۔ ! میں ہر کسی کے ہاں تو آدمی نہیں بھیج سکتا!" اور طوطا رام منہ پھیر کر نوکروں کو کاروباری ہدایتیں دینے لگ گیا۔

"اچھا طوطا رام" میں نے چلنے کے انداز میں کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ کھنّا صاحب کے راج میں یہ تکلیف بھی دیکھنی پڑے گی!"

کھنّا صاحب کا نام سنتے ہی طوطا رام کے روّیہ میں ایک دم فرق آگیا۔ اسے شاید اپنے تیل کا پرمٹ منسوخ ہوتا دکھائی دیا۔ یا شاید چینی کے پرمٹ کی درخواست کی منظوری کی [illegible] ختم ہوتی معلوم دی۔

رکیئے جناب!" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ تحصیلدار صاحب کے آدمی ہیں۔ تحصیلدار صاحب تو ہمارے مائی باپ ہیں آپ کوئی فکر نہ کیجئے میں شام کو آدمی بھیج کر ضرور خبر کر دوں گا!"

اگلے دن صبح جب میں پانچ بجے طوطا رام کی دکان پر پہنچا تو جیپ قریب قریب لد چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی لالہ طوطا رام مجھے لینے کے لئے آگے بڑھ آئے۔

"آیئے آیئے آنند صاحب۔ آپ نے تو کافی دیر کر دی۔ دیکھئے نا سب لوگ آ چکے ہیں۔ خیر میں نے آپ کے لئے فرنٹ سیٹ کا بندوبست کر دیا تھا!"

"بے حد شکریہ لالہ طوطا رام" لالہ طوطا رام نے اپنے ہاتھوں جیپ کی اگلی سیٹ اپنے سبز صافے سے صاف کرتے ہوئے مجھے جیپ میں بٹھا دیا۔

"ارے کہاں مر گیا یہ جگدیش لعل!" اور پھر پاجامے کے اوپر خاکی بش کوٹ پہنے ایک نوجوان سامنے کھڑا ہو گیا۔ جو کہ شاید جیپ کا کلینر اور کنڈکٹر معلوم ہوتا تھا۔

اسے سامنے موجود دیکھ کر لالہ طوطا رام نے اسے گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

"ابے حرام خور! سامنے کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے۔ جا آنند صاحب کے لئے چائے لے آ۔"

"لالہ طوطا رام۔ میں تو ابھی ابھی چائے پی کر آ رہا ہوں۔"

"اجی یہاں کی چائے کا لطف ہی اور ہے! ارے جا کم بخت دیکھ کیا رہا ہے؟"

انھوں نے جگدیش لال اور ڈرائیور مکھن لال کو میرے بارے میں خاص ہدایتیں دیتے ہوئے کہا۔

"اوے مکھنا۔ یہ تحصیلدار [illegible] ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔ سمجھا؟"

جیپ کے چلنے کے بعد میں نے [illegible] نو سواریاں اور تھیں۔ شاید میرے اور تحصیلدار صاحب کے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے لالہ طوطا رام نے آج کچھ کم سواریاں بٹھائی تھیں۔ پچھلی سیٹ پہ ایک ہی فیملی کے افراد بیٹھے معلوم ہوتے تھے، مرد، عورت۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکے نے COW BOY سوٹ پہن رکھا تھا جس کی بے شمار جیبیں تھیں۔ ان میں سے کئی ایک ببل گم، ٹافیاں، چاکلیٹ اور نہ جانے کن کن چیزوں سے ٹھسی پڑی تھیں۔ اس کی عمر دس گیارہ برس کی تھی اور وہ اپنی بہن سے نہایت ہی شائستہ انگریزی میں بات چیت کر رہا تھا۔ بہن کی عمر شاید اٹھارہ، انیس برس ہوگی وہ جینز JEANS

اور بلاوز میں نہایت سمارٹ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے شانوں پر کٹے ہوئے خوب صورت بال نہایت دل آویز طریقے سے بکھرے ہوئے تھے عورت نے چیک ہاف کوٹ کے ساتھ ورسٹڈ WORSTED پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا رنگ قدرے سانولا تھا۔ لیکن اس کے چہرے اور آنکھوں سے غیر معمولی طور پر خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ گویا وہ ہمیشہ اپنی راہ خود بنانے کی قائل ہو۔ وہ بار بار اپنی گردن کو جھٹکاتی تو اس کے ترشے ہوئے بال اس کی صراحی دار گردن کے ساتھ الجھ جاتے۔ اس کی گردن سے بائیوکلرز لٹک رہے تھے۔ مرد نے لمبی باہوں والا پیلے رنگ کا سوئٹر پہن رکھا تھا اور اس کے کندھے سے رولیکس کیمرہ لٹک رہا تھا اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا گویا وہ اپنی بیوی کے رعب و دبدبے سے بے حد مرعوب ہو۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ پہنہ فیملی تھی۔ اس فیملی کے تمام افراد صرف انگریزی ہی میں بات چیت کرنے کے قائل تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے یوں گمان ہوا گویا یہ لوگ ہند کی سرزمین سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کی جڑیں کسی مغربی ملک میں ہی پیوست ہوں۔ بات چیت کے دوران میں معلوم ہوا کہ مسٹر پہنہ محکمہ خارجہ میں کسی عہدے پر فائز تھے لیکن وہ ابھی ہندوستان سے باہر نہ جا سکے تھے!

اس سے پچھلی سیٹ پر کھڑکی کے قریب پروفیسر گوئل اور ان کی بہن مدھو اسود صاحب اور ان کے دوست بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ ٹول بکس اور جیبری کینوں کی کچھ نشستیں تھیں جن پر کالج کے دو تین بے فکرے طلبا بیٹھے ہوئے تھے پروفیسر گوئل کا چہرہ ان سب میں نمایاں تھا۔ ان کی لمبی سپاٹ ملٹش مونچھیں دیکھ کر ملٹری کے کسی کپتان کا گمان ہوتا تھا لیکن یہ جان کر سخت تعجب

ہوا کہ انھوں نے فلاسفی میں ایم ۔ اے کیا ہوا تھا۔

جیپ کا ڈرائیور مکھن لعل بات چیت سے ہوشیار پور کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سر کے بال بہت چھوٹے تھے گویا کسی کھیت میں ٹریکٹر سے نئی نئی کٹائی کی گئی ہو۔ اس کی گردن میں ایک چاکلیٹ رنگ کا مفلر تھا۔ جس کا پلو اس کے گھسے ہوئے کوٹ کے شانے سے ہر وقت کھسکتا رہتا اور مکھن لعل ہر دو ایک منٹ کے بعد اس ڈھلکتے ہوئے پلو کو ایک جھٹکے سے واپس شانے پر ڈال دینے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

جیپ نے ابھی خالی کا بازار طے کر کے ڈاک بنگلہ کے پاس واقع بیاس کا پل ہی پار کیا تھا کہ وہ اچانک رک گئی۔ ڈرائیور نے جھنجلا کر پانچ چھ بار سیلف لگایا لیکن انجن ہر بار ایک لمبی دیر تک کراہنے کے بعد خاموش ہو جاتا۔

" ڈھیر ہو گئی " جگدیش لعل کلینر کھڑکی میں سے کود کر انجن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے بونٹ پر ہاتھ رکھ کر جیپ کے انجن کی نبض ٹٹولتے ہوئے معائنہ کیا۔

مکھن لال بھی تیزی سے بیڑی کے کش لگاتا۔ مفلر کے کھسکتے ہوئے سرے کو شانے پر جھٹکے سے ڈالتا نیچے اتر آیا۔

" جیپ تو اب کباڑا ہو گئی! میں نے تو رات کو ہی طوطا رام سے کہہ دیا تھا کہ صبح جیپ نہیں جائے گی! لیکن چودھری طوطا رام کسی کی سنے تو نا! وہ تو کھٹملوں میں سے بھی تیل نکال کر رہے گا! "

مسافروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"وٹ نانسینس!" مسز مہتا نے عجب سا منہ بنا کر جیپ کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا بھائی!" پیچھے سے ایک آواز آئی۔

"یہ جیپ کیا اب پہاڑ چڑھنے لائق رہ گئی ہے۔! اور وہ بھی دو تہائی تنگ کی چڑھائی!" مکھن لال نے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

"آخر بھئی اب ہوا کیا ہے؟" ایک دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

"اجی ہونا کیا ہے!" مکھن لعل نے جیپ اور طوطا رام کو کوستے ہوئے کہا۔ "آدھ میل چلاؤ پلگوں میں تیل آجاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میرے ڈیڈی کے پاس بھی ایسی ہی ایک گاڑی ہے اسے بھی یہی بیماری ہے! تم ذرا پیٹرول نکالو۔" اندر بیٹھے ہوئے کالج کے ایک طالب علم نے جیپ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھا دھوپ سن رائز!" پروفیسر گوئل نے جیپ میں بیٹھے ہوئے اپنی بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کتنا دل کش نظارہ ہے۔ نگر کی پہاڑیوں کے پیچھے کس قدر اجالا ہو رہا ہے!"

پروفیسر گوئل کی بہن مدھو نے مسز مہتا کی لڑکی کمی سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا آپ میرانڈا ہاؤس میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہیں! میں چنڈی گڑھ میں گورنمنٹ کالج میں ایم، اے ہسٹری کر رہی ہوں!" وہ کمی کے ترشے ہوئے بالوں اور جمپر کو نہایت مرعوب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

دوسرے مسافر بھی آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"دراصل پہاڑ پر چڑھتے وقت جتنا مختصر سامان ہو۔ اتنا ہی اچھا رہتا ہے اب اتنی بھاری برساتیاں اٹھاؤ۔ اپنے آپ کو تو اٹھانا مشکل ہوتا ہی ہے۔ برساتیاں اٹھانے کی مصیبت اور جھیلو!"

"لیکن اگر راستہ میں بارش آجائے تو! میں تو یہی سوچ کر چھتری اٹھالایا ہوں!" ایک دوسرے مسافر نے کہا — "اگر بارش آجائے تو چھتری ورنہ چڑھائی پر چھڑی کا کام تو دے گی ہی —"

"ارے یہ بیچاری چھتری کیا کرے گی روہتانگ پر! آپ نے نہیں سنا ایک بجے کے بعد تو وہاں اتنی زور سے ہوا چلتی ہے کہ کئی بار انسان تک اُڑ جاتے ہیں!" مسٹر سود نے کہا۔

"سننے میں آیا ہے کہ ایک بار روہتانگ پر دو سو مزدور کام کر رہے تھے اک دم روہتانگ کے تیور بدلے اس زور سے ہوا چلنے لگی کہ دو سو کے دو سو مزدوروں کو اڑا کر لے گئی، ان کا نام و نشان تک نہ مل سکا!" مسٹر سود کے دوست نے کہا جو اسی علاقہ کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔

"اجی کچھ نہ پوچھیے روہتانگ کے! اسے چین تھوڑا ہی آتا ہے جب تک ہر سال بیس پچاس قربانیاں نہ لے لے،" ڈرائیور مکھن لعل نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔ اور پھر جیپ ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔

"مما۔ روہتانگ بہت DANGEROUS ہے!" کٹی نے اپنی بڑی بڑی خوفزدہ

آنکھوں سے مسز مہتہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہتا تھا ۔۔۔!" مسٹر مہتہ نے مسز مہتہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم ڈیڈی، اور ڈیڈی کی ڈارلنگ بیٹی وہیں منالی میں رہ جاتے تو اچھا تھا۔ اب بھی وقت ہے!" اور مسٹر مہتہ سہم کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں جیپ کا انجن کھانسا اور پھر چند لمحوں کے بعد جنگھاڑتا ہوا اسٹارٹ ہو گیا۔ جیپ کے باہر کے لوگ، باری باری اندر کودنے لگے جیپ آہستہ آہستہ چلنے لگی اور پھر اس کی رفتار بڑھنے لگی۔ جب مکھن لعل نے دیکھا کہ باقی تمام سواریاں بیٹھ گئی ہیں اور صرف جگدیش لعل باقی رہ گیا ہے تو اس نے جیپ کی رفتار اور بھی بڑھا دی۔ لیکن جگدیش لعل نے پھرتی سے ایک جست لگائی اور وہ جیپ کے اندر تھا۔ اس نے اطمینان سے دوسری ٹانگ اندر کرتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے ڈرائیور مکھن لعل سے کہا۔

"کیوں استاد! یہیں ہی ڈھیر کر دوگے؟"

مکھن لعل کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ مسٹر مہتہ کے لڑکے ڈولی اور کالج کے لڑکوں کو جگدیش لعل کو اس طرح دوڑتے دیکھ کر مزا آگیا تھا جیپ کے سب مسافر ہنس رہے تھے۔

جیپ پہاڑ کے دامن سے لپٹی ہوئی پیچیدہ سڑک پر بے تحاشہ بھاگے جا رہی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ہی پچاس فٹ نیچے بیاس کا پانی شور کرتا پتھروں کو پیٹتا، جھاگ کی لمبی لکیریں کھینچتا ایک عجب شان سے بہا چلا جا رہا تھا

سڑک مشکل سے دس بارہ فٹ چوڑی ہوگی۔ لیکن جیپ کی رفتار بیس میل سے کم نہ تھی۔ ہر موڑ کے ساتھ جیری کین اور ٹول بکس پر بیٹھے ہوئے مسافر دوسروں پر گر پڑتے یا جیپ کی کھڑکیوں میں الجھ کر رہ جاتے۔ ایسے موڑوں پر اکثر اعصابی قہقہے لگتے جو کہ شاید اپنے اپنے ڈر کو چھپانے کے لئے لگائے جاتے۔ ان قہقہوں میں کٹی کی سریلی آواز نہایت نمایاں ہوتی جو ہر بار "ادمی" یا "اوپپا" کہہ کر مسٹر مہتہ یا مسز مہتہ کے اوپر گر جاتی۔ کئی بار وہ گھوم کر پیچھے بیٹھے ہوئے کالج کے طلبا کی طرف دیکھنے لگ جاتی۔

ایک بار ایسے ہی خطرناک موڑ کے بعد پیچھے سے آواز آئی۔

"جو صاحبان انشورنس کے خواہش مند ہوں، اس طرف رجوع کریں بندہ لائف انشورنس کارپوریشن سے اسی خدمت کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے کھڑکی سے باہر گرتے ہی انشورنس کی کل رقم کا چیک آپ کے ہاتھوں میں تھما دیا جائے گا۔"

"تاکہ وہ کیش ہی نہ ہو سکے! لینے والا بچے گا تب نا!" پروفیسر گوئل نے لقمہ دیا۔

سب لوگ ہنسنے لگ گئے۔

"ڈرائیور صاحب آپ کو بھگوان کے دربار میں پہنچنے کی کیا جلدی ہے خواہ مخواہ آپ ہمیں بھی گھسیٹ کر لے جائیں گے کیا!" مدھو نے کہا۔ "بی بی جی آپ فکر نہ کیجئے گا،" مکھن لعل نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی فکر تو پچھلوں کو ہوگی۔ آپ کو اور ہمیں کیا کرنا ہے!" پچھلی سیٹ

سے اس لڑکے کی آواز آئی جس نے جیپ کا انجن درست کرنے میں مدد دی تھی اس کا نام رنجیت تھا۔

ایک بار پھر قہقہے لگے۔ کٹی نے ہنستے ہوئے ذرا سی گردن پھیر کر رنجیت کی طرف دیکھا اور پھر اس نے جلدی سے گردن موڑ لی۔

سامنے ایک نالے پر لکڑی کے تختوں کا پل تھا جس کے پاس ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا "ایک ٹن سے بھاری گاڑی نہیں جا سکتی۔ رفتار ۵ میل" لیکن شاید مکھن لعل نے یہ بورڈ پڑھا نہیں کیوں کہ جیپ نہایت بے نیازی سے اسی رفتار سے پل پار کر گئی۔ پل کانپا، لکڑی کے تختے چرچرائے اور جیپ کے مسافروں کو نیچے تیز بہتا ہوا جھاگ دار پانی اور بڑے بڑے خوفناک نوکیلے پتھر اور قریب دکھائی دینے لگے۔

"ابھی ابھی ان صاحبان کے لئے وقت ہے جو ابھی تک اپنی زندگی میں انشورنس کے قائل نہیں ہوئے!" سب پھر ہنس پڑے۔ "ورنہ موت کے بعد تو ضرور ہونا ہی پڑے گا!" مسٹر مہتہ نے اضافہ کیا۔ لیکن اب کے کوئی ہنسا نہیں۔

کانپتا اور تھرتھراتا ہوا پل پیچھے رہ گیا۔

"ڈرائیور صاحب آپ کو یقین ہے کہ ہمیں واپسی پر پل اپنی جگہ پر ہی ملے گا!" رنجیت نے جیپ کے پچھلے شیشے میں سے لرزتے ہوئے پل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مکھن لعل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ڈھلکتے ہوئے مفلر

کو ایک جھٹکے کے ساتھ پھر کندھے پر ڈال دیا۔ جگدیش لعل کے چہرے پر ایک میکانکی مسکراہٹ تھی۔ شاید وہ کہنا چاہتا ہو: "ڈھیر ہوگیا"

جیپ بھاگتی رہی۔ سامنے پہاڑ کی برف آلود چوٹیاں بار بار موڑوں میں آکر گم ہو ہو کر ابھرتی رہیں۔ مسٹر مہتہ اسو کلرہیں سے دھوپ کی روشنی میں چمکتی ہوئی چوٹیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا لڑکا ٹونی کوٹ لوائے سوٹ کی جیب میں سے چاکلیٹ نکال کر کھا رہا تھا۔ مسز مہتہ نے پرس میں سے سیاہ عینک نکال کر پہن لی۔ عینک کے سفید اور چمکدار شیشوں پر پہاڑ کی چوٹیاں اور بیاس کا جھاگ دار پانی رقص کرنے لگا۔ گیتی کبھی کبھی سب کی نگاہیں بچا کر رنجیت کی طرف دیکھ لیتی۔ اسے رنجیت کا چوڑا سینہ اور ذہین چہرہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ رنجیت نے سفید نائلون کی قمیص کے ساتھ ایک گہرے نیلے رنگ کا سوئٹر پہن رکھا تھا جس کے گلے میں اس نے ایک پیلے رنگ کا پھولدار ریشمی مفلر اڑس رکھا تھا اس کا جسم بہت جفاکش اور توانا تھا وہ بھی گیتی کے اس طرح بار بار دیکھنے سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

مسٹر مہتہ سود صاحب اور پروفیسر گوئل باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

"منالی کی وادی ایک گلیشیر کے پگھل جانے کی وجہ سے بنی تھی۔" سود صاحب کہہ رہے تھے۔

اسی لئے شاید منالی کے آس پاس اتنے بڑے بڑے دیوقد وزنی پتھر ہیں!" پروفیسر گوئل نے سود صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے اب بھی ہر سال منالی میں گلیشیر چلے آتے ہیں۔"

مسٹر مہتہ نے باتوں میں پیوند لگایا۔

"اور آپ نے مان لیا!" پروفیسر گوئل نے حیرانی سے کہا۔ "اجی صاحب پہلگام کے نزدیک جو کولائی گلیشر ہے وہ بڑے بڑے سائینس دانوں کے خیال کے مطابق صرف ڈیڑھ انچ سالانہ کی رفتار سے نیچے آرہا ہے اس اندازے سے اسے پہلگام پہنچتے پہنچتے سیکڑوں سال لگ جائیں گے!"

مسز مہتہ نے سیٹ کے نیچے سے انھیں ٹھوکا دیا۔ اور مسٹر مہتہ کھسیانے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگ گئے۔

جیپ اب پہاڑوں کے ایک سلسلے کو چھوڑ کر دوسرے سلسلے میں پہنچ گئی تھی۔ دیودار کے درختوں کے جھنڈ اب گھنے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اب چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ موڑ بھی اب بکثرت تھے سامنے ایک ہیرپن موڑ تھا جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ یہ موڑ بے حد تیکھا تھا اور یہاں سے جیپ کو موڑنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا کھشن لعل نے موڑ کے قریب پہنچ کر جتنی جیپ مڑ سکتی تھی موڑ لی اور پھر اس نے بیک کرنا شروع کر دیا۔ میں فوراً گھبرا کر نیچے کود پڑا لیکن میں نے دیکھا کہ جگدیش لعل مجھ سے پہلے ہی کود کر باہر کھڑا تھا اور جیپ کے بیک کرنے میں ہدایتیں دے رہا تھا۔

"تھوڑا اور۔ تھوڑا بائیں۔ ہاں بس۔ ذرا اور —"

میں نے دیکھا کہ جیپ کا پچھلا حصہ بیاس کے اوپر گہری کھڈ میں جھانک رہا تھا جیپ کے پچھلے پہیئے سڑک کے کنارے سے صرف چھ انچ دور رہ گئے تھے مسز مہتہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور مسٹر مہتہ رومال سے اپنی پیشانی پر

سے کے پسینے کے قطروں کو ہوا دے رہے تھے۔ ٹونی کا چہرہ خوف زدہ تھا۔ پروفیسر گوئل سڑک کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کٹی نے پیچھے کھڈ کی طرف دیکھا تو اس کے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"۔۔۔ تھوڑا اور ۔۔۔" میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے گلے میں چیخ پھنس کر رہ گئی تھی۔ ایک لمحہ بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو جیپ مڑ کر اوپر والی سڑک پر تھوڑی دوری پر کھڑی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

"یہاں تو ڈھیر ہی ہو گیا تھا!" مہتہ صاحب کے لڑکے ٹونی نے جگدیش لعل کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی جیسے مسافروں کے ڈر سے منجمد چہرے مسکراہٹوں اور قہقہوں میں بدل گئے۔

جیپ کا انجن پھر چیخا اور چڑھائی پر آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔

"اب تو کوئی ایسا کافر نہ ہوگا جو انشورنش پر ایمان نہ لے آئے۔"

"کیوں بھئی تم نے انشورنس ایجنٹ بننے کی ٹھانی ہے کیا؟" سود صاحب نے پوچھا۔

"اگر کبھی بننے کا قصد کرو تو کم سے کم اپنی اسامیوں کو روتھانگ پاس لا کر طوطا رام کی جیپ میں ضرور لے جانا!" رنجیت نے مشورہ دیا۔

کٹی نے گردن گھما کر رنجیت کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے موتی نما دانت کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار معلوم ہوتے۔ قہقہوں کا ایک شور اٹھا اور مسافروں کا ذہنی کھچاؤ اس شور میں ڈھل گیا۔

جیپ اب اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں دریائے بیاس روہتانگ پاس اور دیالا کی پہاڑیوں کو چھوڑ کر کوٹھی کے پاس ایک گہری کھڈ میں داخل ہوتا ہے۔ مسز مہتہ بانو کلر لے کر کھڈ کا جائزہ لینے لگیں۔

"آپ جانتے ہیں پروفیسر گوئل، اس کھڈ میں بیاس کتنا گہرا ہے۔ کم سے کم پچاس فٹ ہے!"

پروفیسر گوئل نے کھڈ کی طرف جھانک کر دیکھا اور کہا۔ "مہتہ صاحب وہ پتھر تو مجھے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ دریا کا پانی ان چھوٹے چھوٹے پتھروں کو تو ڈبو نہیں سکا۔"

مہتہ صاحب نے جب پانی کی سطح سے اونچے پتھر دیکھے تو وہ بغلیں جھانکنے لگے مسز مہتہ نے ان کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا گویا وہ انھیں اپنی زبان کو لگام دینے کی تنبیہہ کر رہی ہوں۔

اچانک جیپ پھر رک گئی۔ اس کا انجن جواب دے رہا تھا۔ انجن کے پاس سے بھاپ کے بادل نکل رہے تھے۔

"انجن گرم ہو گیا ہے،" ڈرائیور مکھن لعل نے کہا۔ "کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

جگدیش لعل قریبی چشمے سے بھاگ کر پانی لے آیا اور انجن میں ڈالنے لگا جیپ سے سب لوگ اتر کر ادھر ادھر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ سود صاحب اور ان کے ساتھ دو ایک ساتھی سڑک کے کنارے لگی ہوئی جڑی بوٹیوں کا معائنہ کرنے لگ گئے کالج کے لڑکے فلمی گیت گنگنانے لگے۔ مسز مہتہ پریشانی کی حالت میں ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور مسز مہتہ بانو کلر لئے بیاس کے پتھروں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے

پروفیسر گوئل اور مدھو کیمرہ سے کچھ تصویریں لے رہے تھے۔ رنجیت اور کمّی ایک کونے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے اور بات بات پر مسکرا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ڈرائیور مکھن لعل نے سب کو جیپ میں بیٹھنے کے لئے کہا جب سب بیٹھ گئے تو اس نے سیلف لگایا لیکن کئی بار کوشش کرنے پر بھی جیپ سٹارٹ نہ ہو سکی۔ جگدیش لعل نے دھکا لگانے کا مشورہ دیا اور سب لوگ دھکا لگانے لگ گئے۔

"لو بھئی دو تہائی کے مزے تو یہیں آنے لگ گئے ہ۔" پسینے سے شرابور سود صاحب نے کہا۔

رنجیت اور کمّی جو دوسرے سرے پر جیپ کو ڈھکیل رہے تھے چونک پڑے۔ ڈھکیلتے وقت کمّی کے ہاتھ رنجیت کے ہاتھوں سے مس ہو رہے تھے لیکن یہ جان کر کہ اس فقرے کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دونوں ہنسنے لگے۔

"ڈیم دس طوطا رام اینڈ ہز جیپ۔" مسز مہتہ آگ بگولا ہو کر بولیں۔ مسٹر مہتہ پسینے پسینے ہو رہے تھے۔

"سب مل کر ایک زور کا دھکا لگاؤ۔" سود صاحب نے کہا۔ "لو بھئی۔۔۔ ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین ۔۔۔"

اور جیپ سٹارٹ ہو گئی۔

سب بھاگ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ اب کی بار جگدیش لعل سب سے پہلے لپک کر اندر آگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دہلا کی آبادیاں نظر آنے لگیں اور ہم چند ہی منٹوں میں دہلا پہنچ گئے۔ مسٹر مہتہ نے اپنی فیملی کے لئے دو گھوڑوں کا انتظام کیا ہوا تھا تاکہ تھک

جانے پر دہ باری باری بیٹھ گئیں۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ہم لوگ روہتانگ
کے لئے روانہ ہو گئے۔

روہتانگ پاس کی چڑھائی میرے تمام تخیل سے بھی دشوار نکلی۔ پروفیسر گوئل
، دھوا اور میں کسی نہ کسی طرح ہانپتے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے بالآخر روہتانگ پہنچ
گئے۔ ہمارے سوا اور کوئی روہتانگ نہیں پہنچ سکا۔ چڑھتے وقت ہم نے اوپر بلندیوں
سے دیکھا تھا کہ گپتی اور رنجیت چلتے ہوئے روہتانگ کی انجانی راہوں میں کھو گئے تھے
سر مہتہ اور مسز مہتہ اس کمر توڑ چڑھائی پر اتر کر گھوڑوں کو کھینچنے میں مصروف تھے
سود صاحب اور کالج کے طلبا کی پارٹی روہتانگ پاس سے آدھ میل پہلے ہی برف
کے پل کے پاس سے تھک کر واپس لوٹ گئے تھے۔ ہم روہتانگ پاس پار کر کے
لاہول اور سپیتی کی برفانی چوٹیاں دیکھ کر شام کو پانچ بجے واپس دہلا پہنچے تو سب ہمارا
انتظار کر رہے تھے۔

دہلا سے منالی تک کا جو اس یاختہ راستہ ہمیں پھر جیپ میں طے کرنا پڑا۔
جیپ نے اس بار بھی راستہ میں دو تین مرتبہ چلنے سے انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ
تو بریکیں ٹھیک سے نہ لگ سکنے کی وجہ سے زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیے تھے۔
جیپ کی جگہ جگہ مرمت کرتے، دھکے لگاتے، ہم خوش قسمتی سے منالی تک پہنچ ہی گئے
راستہ میں ہم سب نے فیصلہ کر لیا کہ اس قدر بگڑی ہوئی جیپ کا اس قدر خطرناک
پہاڑی راستے پر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمارے "انشورنس ایجنٹ" کی رائے
تھی کہ ہم سب کی انشورنس کا پریمیم لالہ طوطا رام کے ذمہ ہونا چاہیئے۔ ہم نے منالی پہنچتے
ہی طوطا رام کی جیپ کی شکستہ حالت کی شکایت کرنے کی ٹھان لی اور یہ مصمم ارادہ

کر لیا کہ اگر طوطا رام فوراً ہی اس جیپ کی مکمل طور پر مرمت کے لئے تیار نہ ہوا تو اس کی شکایت ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ سے کریں گے۔ اور اگر یہاں پر بھی کوئی اثر نہ ہوا تو نہ صرف یہ شکایت اعلےٰ سے اعلیٰ افسر تک پہنچائی جائے گی بلکہ اخبارات میں ہم سب لوگ شکایتی خطوط لکھیں گے۔

مسٹر مہتہ اور پروفیسر گوئل نے منالی میں جیپ سے اترتے ہی طوطا رام کو بلوایا اور اسے جیپ کو اس قدر شکستہ حالت میں رکھنے کے لئے بے حد ڈانٹ پلائی ہم سب لوگوں کا غصہ اور جوش دیکھ کر طوطا رام کے اوسان خطا ہو گئے اس نے ہکلاتی ہوئی آواز میں جیپ کو اگلے دن سے نہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔ جیپ اگلے روز تو شاید نہیں گئی لیکن اس سے اگلے روز پھر جانے لگ گئی۔ اسی شام کو طوطا رام مجھے بازار میں ملا۔ میں نے جیپ کے بارے میں ذکر کیا۔

"آنند صاحب۔ بھلا مجھے مسافروں کا خیال نہیں ہے کیا؟" اب دیکھئے نا یہ سیزن ہے ہی کتنا، جولائی سے تو بارشیں ہی شروع ہو جاتی ہیں، جون کے بعد منالی میں الّو بولنے لگتے ہیں۔ اب جولائی کے بعد ہی اس کا انجن کھلواؤں گا۔ ویسے تو میں نے اگلے روز ہی تمام ضروری مرمتیں کروا دی تھیں!"

اس کے ایک ہفتے بعد ہی مسافروں سے بھری ہوئی جیپ کی بروقت بریک نہ لگ سکنے کی وجہ سے گہری کھڈ میں گرنے کی خبر تھی۔ اس شام طوطا رام نہایت افسوس سے بازار میں ہر کسی سے ہمدردی طلب لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ "روہتانگ ہر سال اپنے لئے قربانی لیتا ہے کوئی سال نہیں ٹلا۔ اس سال مجھ غریب کی جیپ کی باری تھی! آٹھ ہزار میں لی تھی ابھی سال۔۔!"

نئے پرانے

عابد سہیل کے نام

شہنائی بند ہوگئی۔ بیاہ منڈپ میں بیٹھے ہوئے راجندر نے دالان کے سامنے دروازے پر بنی ہوئی نشست کی طرف دیکھا۔ شام کو جب بارات آئی تھی تو تیز بینڈ باجوں کی آواز کے بعد شہنائی کی یہ مدھر آواز اسے بے حد بھلی لگی تھی۔ سرمئی سایوں کے پس منظر میں شہنائی نواز کی شہنائی پر حرکت کرتی ہوئی انگلیاں اور گیس کی جھلملاتی روشنی میں اس کے پھولے ہوئے تمتمائے گال کسی آرٹسٹ کی جاندار تصویر کی طرح اسے دکھائی دیے تھے۔ زری کی اچکن میں ملبوس، چودھری انداز سے پگڑی باندھے ہوئے وہ جھوم جھوم کر شہنائی بجا رہا تھا۔ اس اعتبار سے راجندر کو اپنے سسرال والے نہایت شائستہ معلوم ہوئے۔

محراب نما دروازے کے ساتھ ساتھ دیواروں کے پاس سرخ، سفید اور سبز رنگ کے بلبوں کی جھالریں جگمگا رہی تھیں ایک کونے میں کرشن جی کا سدرشن چکر مسلسل آواز پیدا کرتے گھوم رہا تھا۔ دروازے کے سامنے سڑک کے پار شامیانہ پر بجلی کے بلبوں سے بنے ہوئے "سواگتم" کے الفاظ نظر آ رہے تھے۔ لوگ کیڑوں کی قطاروں کی طرح ایک دوسرے کا شانہ بچاتے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ فضا میں گہما گہمی تھی۔ کچھ لوگ کھانا کھا کر اندر آ رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا کھانے جا رہے تھے۔ ایک عورت ایک بچے کو گود میں اٹھائے اور دو کو گھسیٹتی ہوئی انھیں ڈانٹتی ڈپٹتی ہوئی باہر کھانا کھلانے لے جا رہی تھی۔ بارات کا ایک نوجوان کسی کو ڈھونڈھنے کے انداز کے بہانے اندر برآمدے میں کھڑی ہوئی لڑکیوں کو تاک رہا تھا۔ بیاہ منڈپ کے پاس راجندر کے کھڑے ہوئے دوست اس کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

راجندر کے ساتھ والی چوکی پر سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی دلہن کو بٹھا دیا گیا تھا۔ لمبا سا گھونگھٹ ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف طور پر وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پنڈت جی ہون کنڈ جلا چکے تھے اور ہنگامے کے شور کو ڈبونے کی خاطر وہ بلند آواز میں منتر پڑھتے جا رہے تھے ہون کنڈ میں جلتی ہوئی سامگری اور گھی کی خوشبو سارے دالان میں رچ گئی تھی۔

راجندر کے پتا چودھری ہیم راج اس کے دائیں طرف پنڈت جی کے پیچھے بیٹھے تھے۔ اس کے سسر لالہ سندر لعل ابھی ابھی باراتیوں سے فارغ ہوئے تھے۔ دراصل بارات کے آتے ہی ملنی کے فوراً بعد ہی دولہا اور دلہن بیاہ کی رسوم

کے لئے بٹھا دیئے گئے تھے۔ چودھری میم راج اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے بہت بیتاب نظر آ رہے تھے۔ پنڈت جی کے ہر منتر کے ساتھ ان کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا۔ ان کی نگاہیں بار بار شاید لالہ سندر لعل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انھوں نے رسوم شادی کی ادائگی کے فوراً شروع کرنے پر احتجاج بھی کیا تھا لیکن لڑکی والوں کے رشتہ داروں اور خود اپنی ہی برات کے چند لوگوں نے لگن نکل جانے کا واسطہ دلایا تھا وہ ظاہراً چپ چاپ بیٹھ گئے تھے لیکن یوں معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی چیز اندرونی طور پر ان کے سکون کو بری طرح بلو رہی تھی۔

راجندر کی ہونے والی ساس کے چہرے پر ایک پر نور سکون تھا وہ اپنے کھچڑی پکے بالوں کو گلابی رنگ کے دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپے دولہن کے عین پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اور لالہ سندر لال نے برت رکھا ہوا تھا اس وقت وہ آنکھیں بند کئے بھگوان کے دھیان میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید وہ دل ہی دل میں بھگوان کا اس شبھ گھڑی کے لئے شکریہ ادا کر رہی تھی۔

دفعتاً ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ ویدی کے چاروں کناروں پر لگے ہوئے کیلے کے بڑے بڑے پتے سرسرانے لگے۔ ویدی پر لگے ہوئے غبارے اور کاغذی جھالریں پھڑپھڑانے لگیں۔ اس سے آویزاں پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے کھلونے آپس میں ٹکرا کر گڈمڈ ہونے لگے۔ راجندر کے عین سامنے ایک بیٹھے ہوئے پوز میں ایک سپاہی لٹکا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔ اسے ہوا کی لہروں پر رقص کرتے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

ہون کنڈ کی متحرک لپٹیں کبھی کبھی ان کی طرف بڑھتیں تو اسے ایک

تکلیف وہ گرمی کا احساس ہوتا۔ پنڈت جی کی آواز ڈگمگائے بغیر اسی طرح منتر پڑھ رہی تھی جیسے پرائمری اسکول میں لڑکے پہاڑے یاد کرتے ہیں۔

یکایک پنڈت جی رک گئے۔

"اب بر اپنا دایاں ہاتھ بدھو کے دائیں ہاتھ پر رکھے"۔ راجندر نے اپنا دایاں ہاتھ سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی اوشا کی طرف بڑھا دیا۔ چوڑیاں کھنکھنائیں اور شرماتے ہوئے اوشا نے بھی اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ راجندر کا دایاں ہاتھ اوشا کے ہاتھ سے گزر کر اس کی کلائی تک جا پہنچا۔ جب اس نے غلطی محسوس کی تو اس نے اپنا ہاتھ قدرے پیچھے ہٹا کر عین اوشا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اوشا کے ہاتھ کا لمس راجندر کی انگلیوں سے مس ہوتا اس کے سارے جسم میں تحلیل ہو گیا۔ راجندر نے نگاہیں اٹھا کر ایک بار اوشا کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ شاید گھونگھٹ میں اوشا بھی مسکرا دی تھی۔

سامنے دروازے میں سے کسی کا قہقہہ سنائی دیا۔ ایک بزرگوار اپنے گرد کے چند آدمیوں کے ساتھ اپنی سفید مونچھیں سہلاتے مٹھی میں پکڑے ہوئے سگریٹ سے زور زور کے کش لیتے ہوئے قہقہے لگاتے چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے ایک بڑے گھیرے والی سفید شلوار پہن رکھی تھی ململ کے سفید کرتے میں ان کا بڑھا ہوا پیٹ جھانک رہا تھا۔ اور ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جو وہ خاص انداز سے گھمانے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

راجندر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ وہ دیوان بشن داس تھے۔ اس کے پتا کے بہت قریبی دوست۔

پنڈت جی اشلوک پر اشلوک بولے جا رہے تھے۔ دو ایک مہمانوں نے جماہیاں لیں۔ پنڈت جی نے سامنے ہی کسی مہمان کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر انھوں نے اکتائے ہوئے لوگوں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"بس ان چند منتروں کے بعد پھیرے شروع ہوں گے"۔

چودھری ہیم راج ایک دم چونک پڑے۔ دیوان لبھو داس کے بھی جیسے کان کھڑے ہو گئے وہ فوراً چودھری ہیم راج کے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گئے انھوں نے کوئی بات ان کے کان میں کہی اور چودھری ہیم راج بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ منھ ہی منھ میں غصے سے کچھ بڑبڑا رہے تھے۔

کچھ دور جا کر چودھری ہیم راج کھڑے ہو گئے اور دیوان صاحب تیزی کے ساتھ شامیانے کی طرف بڑھ گئے۔ اونچی کلاہ پر بوسکی کی پگڑی باندھے چودھری ہیم راج بار بار اپنا سر جھٹک رہے تھے گویا وہ کہہ رہے ہوں "واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی!"

تھوڑی دیر میں دیوان صاحب لالہ سندر لعل کو لے کر واپس آ گئے۔

راجندر بیاہ منڈپ میں بیٹھے بیٹھے کن انکھیوں سے ان حرکات کو بخوبی دیکھ رہا تھا اب یہ تینوں دائیں طرف والے برآمدے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ راجندر اپنے پتا چودھری ہیم راج کا لہجہ لمحہ بہ لمحہ ترش ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ ان کے بازو زور زور سے ہل رہے تھے گویا وہ کسی بات پر بے حد خفا تھے۔ لالہ سندر لعل ہاتھ باندھے مسکین لہجے میں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے

اور دیوان بشن داس بار بار اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی
چھڑی کو گھما رہے تھے۔ دفعتاً چودھری ہیم راج نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور پانچ
انگلیاں دکھائیں۔ پھر اس نے لالہ سندر لعل کو اپنے پتا کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے
دیکھا۔ ان کا چہرہ نہایت بے بس نظر آرہا تھا اور وہ ملتجیانہ نگاہوں سے
چودھری ہیم راج اور دیوان صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دیوان بشن
داس بات بات پر اپنی کلائی کو گھماتے اور ان کی کھلی ہوئی انگلیاں بھی اسی طرح
گھوم جاتیں گویا وہ لالہ سندر لعل کی بے چارگی کا تمسخر اڑا رہی ہوں۔

پنڈت جی اشلوک بدلے جا رہے تھے۔ بیاہ منڈپ میں سے کچھ اور
بزرگ اٹھ کر ان تینوں کے پاس چلے گئے۔ چودھری ہیم راج بڑے جوش و خروش
سے بول رہے تھے انھوں نے ایکدم گھوم کر راجندر کی طرف اشارہ کیا۔ باہیں پھیلا
کر پاؤں سے کمر تک ہاتھ لے جا کر اس کی کوٹ پتلون کا واسطہ دیا۔ گردن کے
گرد ہاتھ پھیر کر جیسے اس کی ٹائی کا واسطہ دیا۔ پھر ہاتھ کی تین انگلیاں ہوا میں
بلند کر کے شاید راجندر کی تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ کا واسطہ دیا اور پھر اس
کے ساتھ ہی منہ پھیر کر یوں چلنے لگے گویا وہ بارات واپس ہی لے جائیں گے۔
لالہ سندر لال نے سخت مایوسی اور منت کی حالت میں سر سے پگڑی اتار کر چودھری
ہیم راج کے پیروں میں رکھ دی اور چودھری ہیم راج نے بڑی سختی سے
پگڑی روند ڈالی۔

شور اور بھی گہرا ہو گیا۔ بیاہ منڈپ میں سے چند اور لوگ بھاگ کر اس
مجمع میں شامل ہو گئے۔ اوشا کی ماں کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چہرے

پر انتہائی درد و کرب کے نشان تھے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا لیا۔ عورتوں کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی ٹولیوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ راجندر نے چور نظروں سے پہلے برآمدے میں جمع شدہ مجمع کی طرف دیکھا اور پھر اوشا کی طرف۔ وہ ویسے ہی سمٹی سمٹائی سر نیچے کئے بیٹھی تھی گویا اسے اس بڑھتے ہوئے طوفان کا بالکل پتہ نہ ہو۔ ویدی سے آویزاں کھلونے ہوا کی روش پر جھول رہے تھے۔ کاغذی جھالریں اور رنگین غبارے پھڑپھڑا رہے تھے۔ یکایک راجندر نے محسوس کیا کہ ویدی سے لٹکے ہوئے سپاہی کی بندوق کا رخ بار بار اس کے سینے کی طرف تھا۔ اشلوک پڑھتے ہوئے پنڈت جی نے نگاہیں اٹھا کر بیاہ منڈپ کی ہلچل کو محسوس کیا اور پھر ان کی نگاہیں مجمع کی طرف گئیں۔ ان کی آواز میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی اور قریب تھا کہ وہ اشلوک بولنا بند کر دے، کہ راجندر نے کہا۔

"پنڈت جی! اس رفتار سے تو مجھے شادی کے لئے یہاں ایک سال رکنا پڑے گا۔ ذرا جلدی کیجئے گا نا!"

"ہاں پنڈت جی ذرا خیال کیجئے گا کہ کہیں کنواروں پر بیٹھے بیٹھے ہی یہ والد قرار نہ پا جائیں!" راجندر کے ایک دوست نے لقمہ دیا۔ فضا میں کھنچاؤ گویا ان قہقہوں میں جذب ہو گیا۔

پنڈت جی جوش سے اشلوک بولنے لگے۔

راجندر نے کن انکھیوں سے مجمع کی طرف دیکھا کچھ لوگ اس کے پتا اور دیوان صاحب کی منتیں کر رہے تھے۔ لالہ سندر لال کی جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ

دوسری طرف چند لوگوں سے مشورہ کر رہے تھے۔ برادری کے چند لوگ انہیں دلاسا دلا رہے تھے اور پھر ایک شخص نے کچھ نوٹوں کی گڈیاں چودھری ہیمراج کو تھمائیں۔ چودھری ہیمراج نے سرسری طور پر گڈیاں گن کر دیوان صاحب کو دیدیں جو تیزی سے ہر گڈی کے نوٹوں کو گننے میں مصروف ہو گئے۔

مجمع دھیرے دھیرے بکھر گیا۔ چودھری ہیمراج اور لالہ سندر لال بیاہ منڈپ میں لوٹ آئے۔ چودھری ہیمراج کے چہرے پر فاتحانہ آثار تھے۔ لالہ سندر لال کی آنکھیں پرنم تھیں۔ ان کی کھلی ہوئی اور مڑی ہوئی پگڑی ان کے بغل میں تھی۔ کسی نے انھیں پگڑی باندھنے کے لئے مدد دینی چاہی لیکن سندر لال نہایت انکساری سے منع کرتے ہوئے سر پر اپنی سیدھی پگڑی باندھنے لگ گئے۔

پنڈت جی نے ایک نگاہ چودھری ہیمراج پر اور پھر دوسری نگاہ لالہ سندر لال پر ڈالی اور پھر جیسے کچھ مطمئن ہو کر انھوں نے راجندر کے دامن کے ساتھ اوشا کا آنچل باندھ دیا۔

سامنے پھیرے ہو رہے تھے۔ سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی اوشا راجندر کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ پوترا اگنی کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔

اوشا کی ماں کے چہرے پر پھر سکون لوٹ آیا تھا۔ لالہ سندر لال کی پرنم نگاہیں اوشا پر جمی تھیں گویا وہ بوجھ اترنے کے بعد بھی ابھی تک بوجھ ہی تھی۔

ڈولی کے لئے ایک پرانی سی کار کھڑی تھی۔ کار پر لگی ہوئی پھولوں کی جھالریں اور غبارے کار کے بوسیدہ رنگ و روغن کو نہ چھپا سکتے تھے۔ کار

کے سامنے چھ آدمیوں کا بینڈ مار چنگ دھن بجا رہا تھا۔ برات کے لوگ کار کے ارد گرد کھڑے تھے۔ کچھ براتی بس پر اپنا سامان لدوانے میں مشغول تھے لڑکی والوں کے خاندان میں تقریباً ہر شخص کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کی گنی چنی عورتیں صرف اوشا کو رخصت کرنے کے لئے جمع تھیں۔ ہر عورت اوشا کو بے دلی سے وداع کرنے کے بعد الگ کھڑی ہو کر باتیں کرنے لگ جاتی۔

"ہائے اوشا بے چاری کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کس قدر لالچی ہیں اوشا کے سسرال والے۔"

"یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ عین پھیروں کے وقت زبان کھولیں!"

"اوشا جیسی سوشیل اور گن ونتی لڑکی کو ایسے سسرال والوں کے پلے باندھ کر اس بے چاری کو قبر میں ہی دھکیل دیا!"

"بے چارے سندر لال کا بال بال قرضہ میں جکڑ گیا۔ پانچ ہزار کی رقم بن تھوڑی تو نہیں ہوتی"

چودھری ہیمراج جب نانی سے ٹہل رہے تھے۔ کلاہ پر بندھی ہوئی پگڑی گویا اور بھی اونچی ہو گئی تھی۔

"لالہ سندر لال، اب ذرا جلدی کرو۔ وقت ہوتا جا رہا ہے۔"

لالہ سندر لال نے چودھری ہیمراج کی طرف پر نم نظروں سے دیکھا اور پھر اوشا کو چھاتی سے بھینچ لیا گویا وہ مجبوراً اپنی لگائے قصائی کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں۔

اوشا کی ماں نے بھی زور سے ہچکی لی اور اوشا سے لپٹ کر رونے لگ گئی اوشا بھی اپنی ماں سے چمٹ گئی۔

"چلو راجندر بیٹا جلدی کرو!" چودھری ہیمراج نے کہا۔

"معاف کیجئے گا پتا جی! میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔" راجندر نے اپنے باپ کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا — "آپ نے مجھے رات کو بیچ دیا تھا نا۔ آپ کو تو میری قیمت مل گئی ہے۔ آؤ اور پھر لالہ سندر لال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب مجھے ان کا قرضہ اتارنا ہے۔ آؤ او تا اندر چلو۔" اور وہ اوشا کو لے کر واپس دروازے کی طرف مڑ گیا۔

چند لمحوں کے لئے ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ لڑکی والوں کے خاندان کے چہرے پر جیسے پھر سے بشاشت لوٹ آئی ہو۔ اور پھر سندر لال کے خاندان کے تمام لوگ جلدی سے دروازے کے اندر چلے گئے اور انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

باہر لگی ہوئی دروازے کی کنڈی دیر تک ہلتی رہی گویا وہ براتیوں کا منھ چڑا رہی ہو۔

سیکیاں اور اندھیرا

حیات اللہ انصاری کے نام

آنند پر جیسے بھوت سوار تھا۔ وہ اس کمرے میں سے نکل کر اس کمرے میں جا، دیوانہ وار چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ بچھے ہوئے پلنگ کا بیڈ کور گٹھری بنا ایک طرف پڑا تھا تکیہ ایک عجیب حالت میں دیوار کے ساتھ ایک بے ڈھنگا زاویہ بناتا، کچھ دیوار کا اور کچھ پلنگ کا سہارا لئے منہ بسورے پڑا تھا۔ کونے میں لگی ہوئی میز پر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ الٹی سیدھی حتیٰ کہ دو ایک کونوں کے سہارے کھڑی تھیں۔ پلنگ کے سامنے پڑی ہوئی تپائی اور کرسیاں درہم برہم تھیں۔ تپائی پر اس کا چرمی بیگ کھلا پڑا تھا۔ اور اس کھلے ہوئے بیگ میں سے بادامی کور کی فائلیں جھانک رہی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا گویا کوئی بہت بڑا طوفان گھر کے ان دو چھوٹے چھوٹے کمروں کو ہلا کر ابھی ابھی چلا گیا ہو۔

آنند کے چہرے پر شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پلنگ

کو تیسری بار ڈھونڈتے ہوئے غصہ سے تکیہ اٹھا کر پائینتی کی طرف پھینک دیا۔ جب وہ جلدی سے مڑا تو اس کا گھٹنا راستہ میں پڑی ہوئی کرسی سے ٹکرا گیا، وہ بلبلا اٹھا اور غصے میں ان کرسیوں کو کوسنے لگا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ چند ہی منٹ پہلے وہ خود ہی ان کرسیوں کی ترتیب کو غارت کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس نے ایک کرسی کو زور سے ڈھکیلا۔ کرسی چرچرائی اور وہ بیٹھ گیا اس نے پانچویں مرتبہ پھر چرمی بیگ سے فائیلوں کو باہر نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

وہ کمبخت رپورٹ کہاں گئی؟ رات کو پہلے اسی کرسی پر بیٹھ کر اور بعد میں پلنگ پر بیٹھ کر اس نے تین گھنٹے دردسری کے بعد اس رپورٹ کو تیار کیا تھا۔ یہ رپورٹ اسے آج ہی بڑے صاحب کو دکھانی تھی۔ مہتہ صاحب دو ایک مرتبہ اس رپورٹ کے بارے میں پوچھ بھی چکے تھے اور اس نے آج رپورٹ کے تیار ہو جانے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ رات کو جب وہ رپورٹ لکھنے بیٹھا تو معمول کی طرح اس کی بیوی ریکھا ٹونی کو سلا چکنے کے بعد اس کے پاس ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے لئے آ بیٹھی۔ اس نے ریکھا کو دیکھتے ہی بلبجیانہ لہجے میں کہا تھا۔

"ریکھا آج مجھے بہت کام ہے! مجھے کل ہی یہ رپورٹ مہتہ صاحب کو دکھانی ہے۔"

ریکھا نے کچھ بھی کہے بغیر ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ مسکرا کر دوسرے کمرے میں آہستہ سے چلی گئی تھی۔ وہ ریکھا کی اس وقتی نزاکت کو سمجھنے کی اہلیت کا ہمیشہ سے شکرگزار تھا۔

وہ نہایت انہاک سے رپورٹ لکھنے میں جٹ گیا اور جب وہ رپورٹ ختم کر چکا تو گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی اسے یاد تھا کہ اس نے نیند کی حالت میں یہ رپورٹ تمام فائیلوں کے ساتھ تپائی پر رکھدی تھی۔ لیکن آج صبح وہ حسب معمول جب سیر سے لوٹا

تو اسے ان فائلوں میں وہ زرد کاغذوں پر لکھی ہوئی چھ صفحوں کی رپورٹ نہ ملی، نہ جانے کہاں چلی گئی تھی!

وہ صبح سے اس رپورٹ کو دیوانہ وار ڈھونڈ رہا تھا، اس نے گھر کی ایک ایک چیز چھان ماری تھی۔ ریکھا نے بھی اسے ڈھونڈنے میں مدد دینی چاہی لیکن وہ آنند کا بگولا جیسا مزاج دیکھ کر اور اس خیال سے کہ آنند کو دفتر کے لئے کھانا لے جانے میں دیر نہ ہو جائے، اس نے رسوئی میں پناہ لے لی تھی۔ اس نے ٹونی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا، تاکہ وہ آنند کی راہ میں حائل نہ ہو ٹونی دیر تک رسوئی میں بیٹھا اپنی ماں کو آٹے کی چھوٹی چھوٹی لمبی تکونی روٹیاں بیل بیل کر دیتا رہا اور وہ اسے دوسری روٹیوں کے ساتھ آگ پر سینک سینک کر دیتی رہی۔

آنند نے رات اور صبح کے تمام واقعات کو ذہن میں دہرایا لیکن اس کے دماغ نے کسی بھی سراغ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ کاغذ کہاں گم ہو گئے؟ گھر میں کون آ سکتا تھا! کوئی باہر سے آیا بھی نہ تھا ہاں شاید ٹونی تھا جس پر شاید ماں کا بھی اختیار نہ تھا ٹونی کا خیال آتے ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ اس رپورٹ کے گم کرنے یا ضائع کرنے کا ذمہ دار صرف وہی ہو سکتا تھا۔ وہ ایک دم غصے سے کانپنے لگا۔

"ٹونی!" اس نے زور سے آواز دی۔ "ٹونی!" وہ چلّایا، اس کے لہجے میں بے صبری تھی۔

چار سالہ ٹونی اپنے پاپا کی آواز سن کر بہت آہستہ آہستہ سہما ہوا کمرے میں

داخل ہوا۔ وہ آنند کے چہرے کو غصہ سے لال دیکھ کر وہیں رک گیا اور نہایت معصومانہ انداز سے دروازے سے لپٹ کر کھڑا ہوگیا۔

"ٹونی کے بچے ادھر آؤ!" ٹونی نے گم سم نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ ایک لمحہ کے لئے ہچکچایا اور پھر آنند کی غصہ بھری آواز کے زیر اثر دھیرے دھیرے اس پر سہمی نظر جمائے آگے بڑھا۔

"تم نے اس میز پر سے کاغذ اٹھائے ہیں؟" ٹونی خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"بدمعاش، کہاں ہیں وہ کاغذ؟ بتاتا کیوں نہیں؟" اور پھر اس نے ٹونی کے گال پر زور سے تھپڑ مارا۔ تھپڑ کے پڑتے ہی ٹونی زور سے چلا اٹھا اس کے اندر خوف اور ڈر کے گھٹے ہوئے جذبات موٹے موٹے آنسوؤں کی شکل میں اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ ٹونی کے زور زور سے رونے کی آواز نے آنند کو اور بھی پریشان کر دیا۔

"خبردار جو تیرے منہ سے آواز آئی!" اور اس نے ایک گھونسہ اس کی پیٹھ پر جڑ دیا۔ ٹونی نے اپنی بھری بھری ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں ملتے ہوئے زور سے سسکیاں لینی شروع کر دیں جیسے کسی نے طغیانی ندی کے منہ پر باندھ دیا ہو۔

ٹونی کے رونے کی آواز سن کر ریکھا دوڑی دوڑی آئی۔ ریکھا کو دیکھتے ہی اس نے غصے سے ٹونی کو اس کی طرف ڈھکیل دیا۔

"سنبھالو اس لاڈلے کو!" وہ جلدی جلدی دفتر کے لئے کپڑے پہننے لگا۔

اسے ڈنی کو مارنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے اس کی انگلیاں غصہ اور افسوس کے جذبات سے ملی ہوئی کانپ رہی تھیں لیکن اس کا دماغ کسی بھی طرح ڈنی کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ جلدی سے سائیکل نکالنے کے لئے آنگن میں نکل آیا۔ لیکن فائلوں کا چرمی بیگ تو اندر ہی تھا۔ اس نے سائیکل پھر دیوار کے ساتھ لگا دی اور بیگ لینے کے لئے اندر چلا گیا۔

ڈنی کے رونے کی آواز کم ہو گئی تھی وہ ریکھا کی گود میں منھ چھپائے اس کی ٹانگوں سے لپٹا کھڑا تھا۔ ریکھا پیار سے اسے دلاسا دے رہی تھی۔ اس کے پاؤں کی آہٹ سن کر ڈنی نے سسکیاں لیتے ہوئے ریکھا کے گھٹنوں میں سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا اور پھر منھ پھیر کر زور زور سے رونے لگا۔

ایک لمحہ کے لئے اس کی نظریں ریکھا کی نظروں سے ملیں۔ لیکن پھر جلدی ہی اس نے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ ریکھا کی آنکھوں میں ملامت کے کوئی آثار نہ تھے لیکن پھر بھی وہ اس سے اپنی نظریں نہ ملا سکا۔ ریکھا کو پتا تھا کہ اس میں آنند کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ چرمی بیگ لے کر باہر نکل آیا۔

"رسوئی میں سے کھانا لیتے جائیے گا!" ریکھا کی مدبھری آواز اس کے پیچھے لپکی۔

اس نے رسوئی میں سے کھانے کا ڈبہ لے کر سائیکل کے پیچھے رکھ لیا اور فائلوں والا بیگ آگے لگی ہوئی بید کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ دفعتاً معمول کی طرح اس کی نگاہیں ڈیوڑھی کی چوکھٹ کی طرف اٹھیں لیکن وہاں کوئی

نہ تھا۔ روزانہ ڈونی اور ریکھا ہاتھ ہلا ہلا کر اسے دفتر رخصت کرتے اور ڈونی اپنی پیاری آواز میں "ٹاٹا بائی بائی" کہتا یہ آواز دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہتی اور وہ گنگناتا جھکتا، زور زور سے پیڈل مارتا دفتر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے ڈونی کا سسکیاں لیتا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ ڈونی اس سے سخت ناراض تھا تبھی تو اس نے اسے دیکھتے ہی منھ پھیر لیا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے سائیکل پر چڑھ گیا اور آہستہ آہستہ پیڈل مارتا روانہ ہو گیا۔

اس کا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ڈونی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ نہ جانے بیچارا قصوروار تھا بھی کہ نہیں۔ آج نہ جانے سائیکل کیوں بھاری چل رہی تھی۔ وہ ابھی سے تکان محسوس کرنے لگا تھا۔ گھسٹ گھسٹ۔ اسے دو ایک مرتبہ گمان ہوا گویا سائیکل کے پہیوں میں ہوا کم ہو۔ وہ سائیکل سے اتر گیا اس نے ٹائروں کو دبا کر ہوا محسوس کی لیکن پہیوں میں اسے ہوا کچھ خاص کم معلوم نہ ہوئی۔ وہ پھر سائیکل پر چڑھ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے ذہن میں کہرا چھا گیا ہو۔ سڑک کے کنارے چلتے پھرتے لوگ گویا میکانکی انداز سے چل رہے ہوں۔ دکانوں پر سجی ہوئی رنگ برنگ چیزیں اپنی کشش اور تازگی کھو بیٹھی ہوں۔ حتیٰ کہ چوراہے پر کھڑا ہوا سپاہی بھی ہاتھ دیتا ہوا ایک لکڑی کا کھلونا سا بن کر رہ گیا ہو۔

اچانک اسے سپاہی کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک اٹھا۔ اس نے سپاہی کے اشارے کے خلاف سڑک پار کر لی تھی اور اب سڑک کے پار ایک دوسرا سپاہی اس کی سائیکل کو پکڑے کھڑا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کی پریشانی کے بعد آنند سائیکل لے کر دفتر پہنچا۔ کونے والی میز پر

رام بھروسے فائلوں پر نوٹنگ دینے میں مصروف تھا اس کے دفتر میں داخل ہوتے ہی اس نے دور کی نظر کا چشمہ جلدی سے لگایا اور آنند کی طرف دیکھنے اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"بڑے بابو نمستے!"

ایک دوسری میز سے کسی نے کھنکھارا، دور سے کہیں سرگوشی ہوئی اور ایک نے ایک دوسرے کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"ارے بڑے بابو آ گئے!" اس جملے میں بڑے بابو کے لئے طنز زیادہ تھا اور ان کی آمد کی اطلاع کم۔

آنند اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ٹرے پر فائلوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ آنند راستے میں سوچتا آیا تھا کہ وہ دفتر پہنچتے ہی رپورٹ کو از سر نو لکھے گا اور دوپہر تک مہتہ صاحب کو پیش کر دے گا لیکن یہاں تو پہلے ہی سے ڈھیروں فائلیں موجود تھیں۔ آنند کا دل بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پہلے رپورٹ مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے دراز میں سے کورا کاغذ نکالا اور قمیض کی جیب میں سے فونٹین پن نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا۔ ارے یہ فونٹین پن کیا ہوا؟ اس نے جلدی جلدی پینٹ کی جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ فونٹین پن وہاں بھی موجود نہ تھا۔ شاید کسی نے بھیڑ میں نکال لیا اسے سخت کوفت ہونے لگی۔ وہ بے دلی سے بیٹھ گیا۔

اسے یکایک رپورٹ کے ابھی تک شروع نہ ہو سکنے کا احساس ہوا۔ اس کی نگاہیں قلمدان کی طرف گئیں جو باقاعدہ استعمال میں نہ لائے جا سکنے کی وجہ سے سوکھا

پڑا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس نے غصے سے چپراسی کو آواز دی لیکن چپراسی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا وہ خود اٹھ کر دفتری کے پاس گیا اور اسے اس کی کوتاہی پر زوروں کی ڈانٹ پلائی، دفتری اس کے اس رویہ کو دیکھکر بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے بڑے بابو ہمیشہ فراخدل، خوش مزاج اور خوش اخلاق معلوم ہوئے تھے۔ دفتری نے فوراً بھاگ کر قلمدان میں سیاہی ڈالدی۔

آنند واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اسے جید تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے کیوں غصہ آ رہا تھا؛ شاید اس کا دل تو اسی وقت سے کچھ بجھ گیا تھا جب اس نے گھر سے رخصت کے وقت ڈنی کو روزمرہ کی طرح ہاتھ ہلاتے، اپنی میٹھی زبان میں "ٹاٹا بائی بائی" کرتے نہیں پایا تھا۔

اس کا دھیان میز پر پڑے ہوئے سفید کاغذ کی طرف گیا اور وہ جلد جلد اپنے منتشر شدہ خیالات کو ترتیب دینے میں لگ گیا۔ اس کا قلم دھیرے دھیرے کسی قدر بے دلی سے کاغذ کی سطح پر گھسٹنے لگا۔ تین صفحے لکھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے خیالات اور طرز تحریر میں وہ روانی نہ لا سکا تھا جو رات والی رپورٹ میں تھی وہ رک گیا اور سوچنے لگا۔ اس کی انگلیوں میں پکڑا ہوا الٹا قلم اس کے گالوں سے مس ہو رہا تھا اچانک کاغذ کی سفیدی میں سے ڈنی کا ابھرتا ہوا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر گڑ گیا۔ اس نے خواہ مخواہ ڈنی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ غصے میں آ کر پیٹ دیا تھا۔ لیکن کمبخت نے رپورٹ کہاں گم کر دی تھی؟ اور اس خیال کے آتے ہی اس کی نگاہیں آخری سطر پر آ کر جم گئیں۔

اس نے اپنے آپ کو جھنجوڑا اور پھر خیالات کا سلسلہ قائم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دفعتاً اس کی نگاہیں اپنی سفید قمیص کی طرف گئیں وہاں نیلی سیاہی کا ایک بڑا سا دھبہ نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ یہ دھبہ یہاں کیسے آیا؟ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم کی طرف دیکھا جس کی نب کے سرے پر رستی ہوئی سیاہی کا ایک قطرہ چغلی کھا رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ سنبھل سکے، وہ قطرہ بھی پہلے دھبہ کے پاس گر گیا۔ اس نے چور نگاہوں سے آس پاس کے کلرکوں کو دیکھا اور پھر اس نے جلدی سے میز پر سے بلاٹنگ پیپر اٹھا کر قمیص کے دھبوں پر لگا لیا جب اس نے بلاٹنگ پیپر اٹھایا تو سیاہی خشک ہو چکی تھی لیکن دونوں دھبے پھیلنے کی وجہ سے آپس میں مل گئے تھے اور وہ اب صرف ایک ہی بہت بڑا دھبہ دکھائی دے رہا تھا —— اس کی لاپرواہی، غیر ذمہ داری اور رسوائی کا سرٹی فکیٹ! وہ بوکھلا اٹھا وہ اس دھبہ کو کسی طرح سے بھی تو دور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس دھبہ کو چھپانے کی خاطر میز کے اندر اور بھی دھنس گیا اور پھر وہ رپورٹ تیار کرنے میں کھو گیا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو چپراسی سامنے کھڑا تھا۔

"آپ کو صاحب نے بلایا ہے!"

اس نے ایک منٹ تک خالی نگاہوں سے چپراسی کا جائزہ لیا

"اچھا میں ابھی آتا ہوں!"

رپورٹ قریب قریب ختم ہو چکی تھی اس نے جلدی سے آخری پیراگراف لکھا اور وہ بہتہ صاحب کے کمرے کی طرف جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

ابھی میز سے دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اسے اپنی قمیص پر نیلے دھبے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے قمیص کو رپورٹ سے ڈھانپ لیا یکایک اسے خیال آیا کہ مہتہ صاحب کو رپورٹ دینے کے بعد وہ دھبہ اس کی عزت و ناموس پر دھبہ بن کر رہ جائے گا۔ اس نے جلدی سے میز پر سے ایک اور فائل یونہی اٹھالی تاکہ وہ بوقت ضرورت اس سے دھبے کو ڈھانپ سکے۔

مہتہ صاحب نہایت غصہ میں تھے اور وہ غصے کی جھنجلاہٹ میں میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ سے کھیل رہے تھے، گویا وہ چند ہی لمحوں میں پیپر ویٹ کسی پر دے ماریں گے۔

" یہ آنند صاحب آپ کیا کرتے رہتے ہیں؟ ابھی تک گھوش صاحب والے کاغذات آپ نے چیف سکریٹری صاحب کو کیوں نہیں بھجوائے۔ میں آپ لوگوں کی لا پرواہیوں اور کوتاہیوں کی جواب دہی کے لئے یہاں بیٹھا ہوں؟"

آنند چپ رہا۔ واقعی وہ کاغذات ابھی تک نہ بھجوائے جا سکے تھے۔ شاید وہ کاغذات اس کی ریک پر نئی آئی ہوئی فائلوں کے انبار کے نیچے دبے پڑے تھے۔

" جی میں بند کرتا ہوں!"

" بارہ بجے تو آپ دفتر آتے ہیں نواب صاحب کام کیا ہوگا خاک؟"

آنند نے ہمیشہ مہتہ صاحب سے اپنے بارے میں تعریف کے الفاظ ہی سنے تھے لیکن آج شائد چیف سکریٹری کی ڈانٹ کا نتیجہ تھا کہ وہ موڈ میں نہ تھے۔ آنند کا دل ٹوٹ گیا۔

"جی آج کچھ دیر ہو گئی!" وہ رپورٹ کے گم ہو جانے اور سائیکل کے چالان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے لب آگے نہ کھل سکے۔

"جائیے آپ جلدی سے کاغذات بھجوائیے۔"

آنند جانے کے لئے مڑا اسے یکایک رپورٹ کا خیال آیا اسے امید تھی کہ شائد یہ رپورٹ اس کا گرا ہوا وقار پھر بلند کر دے۔

"جی وہ کل والی رپورٹ تیار ہو گئی ہے۔"

"رکھ جائیے! مجھے فرصت نہیں کل دیکھوں گا۔"

آنند نے آہستہ سے رپورٹ نکال کر میز پر پڑی ہوئی ٹرے میں رکھ دی ـــــ وہی رپورٹ جس کی خاطر وہ آج دن بھر پریشان رہا تھا۔

رپورٹ نکالتے وقت اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی فائل نیچے گر گئی اور اس کی قمیص کا نیلا دھبہ یکایک عریاں ہو گیا۔

"اور آنند صاحب! یہ دفتر میں ہولی کھیلنا بند کیجئے!"

آنند کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سچ مچ بازار کے بیچ برہنہ ہو گیا ہو۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ تھکا تھکا سر جھکائے مہتہ صاحب کے کمرے سے نکل آیا۔

اس رپورٹ کی کیا وقعت تھی! اس نے صبح خواہ مخواہ اس کمبخت رپورٹ کے لئے اپنے ننھے سے بچے کو بے دردی سے مارا تھا! وہ اس کی خاطر سارا دن پریشان رہا تھا! ٹونی اسے کبھی معاف نہیں کرے گا! دفتر ختم ہو جانے پر وہ اپنے خیالات میں ڈوبا سائیکل پر بیماروں کی طرح پیڈل مارتا گھر جا رہا تھا۔ اس کے جسم کا ہر حصہ تکان سے چور تھا اس کا ذہن ایک عجیب بوجھ سے لدا تھا اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا سارا دن کسی پنکچر شدہ سائیکل پر سوار ہر لمحہ ہچکولے کھاتا گزر رہا ہو۔ گھسٹ گھسٹ گھسٹ گھسٹ۔

اچانک اسے گلی کے کونے سے ٹونی کے شوخ قہقہے سنائی دیئے، جوں ہی ٹونی نے اسے آتا دیکھا وہ اچھل کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔

"پاپا جی آگئے! پاپا جی آگئے!"

اس نے جلدی سے اتر کر سائیکل دیوار کے سہارے لگا دی ٹونی بھاگتا ہوا اس کی گود میں چڑھ گیا۔ آنند کے چہرے پر مسکراہٹ کی قوسیں ابھریں پھر آہستہ آہستہ پھیل گئیں یکا یک اس کے ذہن کی تمام دھول اور دن بھر کی کوفت ٹونی کی پرجوش آواز اور نقرئی ہنسی سے دھل گئی۔

ٹونی کا سر اس کی قمیص کے نیلے دھبے کے ساتھ لگا ہوا تھا جو کہ ایک عجیب طریقے سے اس کے سر کے قریب ہالہ بنائے

ہوئے تھا ۔۔۔ اس نے اپنے فرشتہ جیسے بچے کے گال کو تھپتھپایا اور
پھر وہ اپنی دن بھر کی حماقتوں پر بے اختیار ہنس دیا ۔

ریشماں

احمد جمال پاشا کے نام !!

سگریٹ کے دھوئیں کے یہ وسیع دائرے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ مجھے یہ دائرے بنانے میں کتنا لطف آتا ہے! لیکن یہی گول گول چکر مجھے اس دنیا سے اٹھا کر کسی دوسری دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ تم نے بھی کبھی ایسا محسوس کیا ہے؟ شاید نہیں کیا! اس وقت مجھے ان حلقوں میں ریشماں کا نورانی چہرہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں ریشماں سے کتنا نزدیک ہوں لیکن اس دھوئیں کے فضا میں تحلیل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ریشماں کے چہرے کے نقوش بھی آہستہ آہستہ دھندلے پڑتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ میرے ذہن میں اس کی یاد ایک ہلکی سی کروٹ بدل کر رہ جاتی ہے۔ انسان

کی زندگی میں واقعات کتنی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ ہم تم کبھی اس کی رفتار کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ سب کیسے رونما ہوا؟ اور پھر یہ سب کچھ وقت کے بھاگتے ہوئے رتھ کی دھول میں کیسے غائب ہو گیا؟

میرے نزدیک عورت ایک شراب ہے۔ جب تک اس میں چاندنی کی سی ٹھنڈک، شبنم کی تازگی اور شفق کی رنگینیاں نہیں وہ عورت کہلائے جانے کی مستحق نہیں۔ شاید تمھیں میری رائے سے اختلاف ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم سوچ رہے ہو کہ یہ کتنے سستے اور مادی جذبات ہیں۔ لیکن یہ تجربہ اور وقت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں اور پھر ریشماں تو کم سے کم اسی سانچے میں ہی ڈھالی گئی تھی۔ شفق کی سی رنگینیاں! صرف اسی نے تو ریشماں کی یاد کو میرے ذہن میں اجاگر کر رکھا ہے!

میں سوچتا ہوں کہ ریشماں کی تعمیر ازل سے صرف میرے لئے ہوئی تھی اس کا وجود میری زندگی کا عکس تھا۔ مجھے پہلی ہی ملاقات میں اس کا شدت سے احساس ہوا تھا میں اکثر سوچتا تھا کہ کسی کی قربت کیوں کر کسی کا دل گرماتی ہے، لیکن اس کے بعد مجھے اس امر میں ذرہ بھر بھی شک نہ رہا۔ تم ہنس رہے ہو؟ شاید اس لئے کہ میں حد سے زیادہ جذباتی ہوں، خیالات کی رو میں بہا چلا جا رہا ہوں، لیکن تم نے کب کسی سے محبت کی ہے؟ تم دوسروں کے دلوں کی گہرائیوں کو کیونکر ناپ سکتے ہو؟ محبت انسان کو جذباتی بنا ہی دیتی ہے اور پھر میرے نزدیک جذباتی ہونا کوئی عیب نہیں محض طبیعت

کو ہلکا کرنے کا ایک بے ضرر طریقہ! تو ہاں ریشماں ایک نہایت خوبصورت پہاڑی لڑکی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ وہ بے حد حسین اور شوخ تھی، تم سوچ رہے ہو کہ شاید ناول کی تمام ہیروئنوں کی طرح ہر لڑکی کا حسین اور شوخ ہونا ضروری ہے۔ دراصل یہ الفاظ اتنے عامیانہ اور مانوس ہو کر رہ گئے ہیں کہ اکثر ان کے معنوں میں کچھ حقیقت نہیں رہی لیکن اس سے زیادہ موزوں الفاظ ریشماں کے لئے استعمال بھی نہیں ہو سکتے۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا وہ اس کے لمبے لمبے عنبریں بال تھے۔ ریشم کی طرح ملائم اور نرم۔ مجھے ان بالوں میں ہاتھ پھیرتے یوں معلوم ہوتا جیسے میں کسی مخملی گدیلے کو سہلا رہا ہوں۔

ایک دن وہ میرے پاس آئی۔ اس دن ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی اس کے بال بارش میں بھیگے ہوئے تھے اور ان پر ننھے ننھے قطرے موتیوں کی طرح ٹکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا — "ریشماں۔ تم کتنی حسین ہو، ایک جیتا جاگتا خواب! تم اس وقت بالکل جل پری معلوم ہو رہی ہو بارش کے یہ قطرے چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ تمہارے بالوں پر، تمہارے رخساروں پر یہ قطرے نہایت خوشنما معلوم ہو رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے انھیں چوم لوں!"

وہ ہنس پڑی اس کا منھ کنول کے پھول کی طرح کھل گیا۔ میں نے سگرٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس کے چہرے کے قریب جا کر چھوڑ دیا۔ دھواں اس کے رخساروں اور لبوں سے مس کرتا ہوا فضا میں گم ہو گیا۔ اس نے بڑا سا

منھ بناتے ہوئے کہا۔

"جی چاہتا ہے میں تم سے کبھی نہ بولوں۔" پھر وہ یکایک کھل کھلا کر ہنس پڑی میں نے اس کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے منھ میں موتی اور بالوں میں رات کی سیاہی بکھری پڑی ہے۔ تمھارا چہرہ ان درختوں میں سے سفید جھیل کی طرح جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھیں چاہیئے کہ یہ سب کچھ نظم میں لکھ ڈالو۔ نثر میں کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا!" اور وہ مجھ سے دور صنوبر کے درختوں کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔

میں نے کہا۔ "رلشیاں! بھلا کسی کو تمھارے نزدیک ہوتے ہوئے بھی نثر سوجھ سکتی ہے؟ جب میں تمھارے پاس ہوتا ہوں تو مجھے ان نظموں کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ تمام فضا پر شعریت چھا جاتی ہے اور میں بھی اس کیف بھری فضا کا ایک جزو بن جاتا ہوں۔"

جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو وہ پھر بھاگ کھڑی ہوتی اور ہم ننھے بچوں کی طرح ان چٹانوں اور وادیوں کی گود میں آنکھ مچولی کھیلتے رہتے حتیٰ کہ صنوبر کے درختوں سے بھری ہوئی وادی ہلکے ہلکے اندھیرے میں ڈوب جاتی اور پھر یوں معلوم ہونے لگتا جیسے نیند میں سہانے سپنے پرواز کر رہے ہوں۔ اس وقت ہم کسی چٹان پر بیٹھ جاتے اور طلوع ہوتے چاند کی طرف دیکھنے لگتے۔

ایک دن شام کو ہم جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ کناروں کے قریب سفید سفید کنول کھلے تھے۔ رلشیاں بیٹھی پاؤں سے پانی کی ننھی ننھی لہریں بنا رہی تھی

آسمان پر لالہ گوں شفق کا عکس پانی میں تیر رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ریشماں سے کہا۔ " دیکھا دن رات یوں آپس میں مل رہے ہیں جیسے دور سطح سمندر پر پانی اور آسمان مل جاتے ہیں ——"

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے مسکرائی اور پھر پاؤں سے لہریں بنانے لگی۔ ننھی ننھی لہریں اٹھیں اور انھوں نے بڑھ کر پاس والے سپید سپید کنول کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ریشماں ایک بچے کی سی دلچسپی کے ساتھ پانی کی لہروں پر جھومتے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھ رہی تھی یکایک وہ ایک غیر اختیاری جذبہ کے تحت ایک پھول پر جھک گئی اور نرم نرم بھیگی بھیگی پنکھڑیوں کو گالوں پر پھیرنے لگی۔ اس کے بالوں کی لٹیں ڈھلک کر اس کے چہرے پر آگئیں۔ اس کی گردن میں پڑا ہوا دوپٹہ سرک کر اس کی گود میں آگیا اور شام کے اس دھندلکے میں اس کے جسم کی گولائیاں اور بھی نمایاں ہوگئیں۔

میں نے اس دن پہلی بار عورت کو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ دیکھا عورت ہے ہی کیا: صرف ایک خم! ایک قوس! ایک لطیف جھکاؤ! دنیا کا تمام آرٹ اس کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ دراصل دنیا ہے تو عورت کی گود میں، عقبیٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں! تم نے شاید عورت کو صرف بحیثیت عورت نہیں دیکھا؟ اور اگر دیکھا ہے تو تم میں وہ وجد آور احساسات نہیں پیدا ہوئے۔ تم کسی "شاہکار" کو دیکھنے کے بعد یوں محسوس کرنے لگتے ہو جیسے کہ تم بغیر پر کے ہواؤں میں اڑے جا رہے ہو اور تمھارے آس پاس شفق کی رنگینیاں لہرا رہی ہوں۔ تم ان رنگینیوں میں اونچے ہی اونچے اڑتے چلے جاتے ہو حتیٰ کہ تم فضا کی لطافتوں میں گم ہو جاتے ہو۔ تم سوچ رہے

ہو کہ شاید ان احساسات نے مجھے کسی حد تک مادہ پرست بنا دیا ہے در اصل مادہ پرستی روحانی رشتے کی طرف پہلا قدم ہے۔ دیکھنے میں یہ تھیوری شاید تمہیں عجیب معلوم ہو لیکن یہ سچائی پر مبنی ہے۔ تو خیر مجھے اس دن محسوس ہوا کہ ریشماں کے بغیر میری زندگی نامکمل خواب ہے۔ دن کو اٹھتے بیٹھتے اور رات کو سوتے وقت ریشماں کا نوخیز حسن اور اس کا اٹھتا ہوا شباب میری زندگی پر ایک جنون بن کر چھا گیا۔ میں تمام دن جھیل کے کنارے بیٹھ کر ریشماں کے لئے پھولوں کے ہار گوندھا کرتا اور جب وہ شام کو میرے پاس آتی تو میں ان ہاروں کے تحفے دیکر پھولا نہ سماتا۔ میں سمجھنے لگا کہ ریشماں صرف میرے اور میرے لئے ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ اکثر نوجوان ریشماں کے گرد منڈلایا کرتے تھے۔ میں نے ریشماں سے اس کی بابت کہا۔ اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "بس اتنی سی آزمائش سے ڈر گئے!"

میں نے کچھ جواب نہ دیا اور درخت کے سہارے کھڑا رہا۔ وہ ہرنیوں کی طرح اچھل کر ٹیلے پر چڑھ گئی اور بڑے سے چیل کے درخت کے نیچے میرا انتظار کرنے لگی۔ میں خلاف معمول وہیں درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں روزمرہ کی طرح اس کا پیچھا کروں گا۔ وہ یہ دیکھ کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"آج تم میرے باتوں سے ہنیں کھیلو گے؟" اس نے کچھ دیر کے بعد نہایت پیار بھرے انداز میں کہا اور اپنا سر میرے زانو پر رکھ دیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے بال سہلانے لگا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ایک عجب چمک کوند گئی۔ وہ مسکرانے لگی۔

"تم ذرا سی بات پر روٹھ گئے۔ تمھاری محبت کی قسم میں تمھارے سوا اور کسی سے محبت نہیں کرتی!" یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ میری آغوش میں چھپا لیا۔

ٹھہرو۔ سگریٹ بجھ گیا ہے۔ میں ذرا نیا سگریٹ جلالوں۔ لو تم بھی پیوگے؟ یہ لو دیا سلائی کا یہ کپکپاتا ہوا شعلہ بھی مجھے ریشماں کی یاد دلا دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح کانپتے ہوئے شعلے کی طرح وہ رقص کرتی ہوئی مجھے اپنے پیچھے بھاگنے کی دعوت دیتی۔ آہ کس قدر فرحت افزا تھے وہ لمحے! تو ہاں میں کچھ دن تک اسی طرح محبت کے رنگین تصورات کے جھولے میں جھولتا رہا۔ ہم روزانہ جھیل کے کنارے ملتے چاندنی راتوں کو ریشماں مجھے نہایت میٹھے گیت سناتی اور ہم جھیل میں پاؤں ڈالے پہروں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ آسمان پر ستارے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے اور جھیل کی سطح پر چنار کے خاموش سائے تیرتے رہتے۔

ایک دن میں جھیل کے کنارے ذرا دیر سے پہنچا۔ ریشماں کنارے پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی منھ پھلا لیا اور کہنے لگی

"آپ نہیں جانتے انتظار کتنی بری چیز ہے کہتے ہیں انتظار کرنے سے عمر گھٹ جاتی ہے!"

وہ یہ کہتے ہوئے کہنیوں کے سہارے گھاس پر لیٹ گئی اور اپنی ٹھوڑی کو ہاتھوں پر ٹکا دیا اور اس کی چوٹی ڈھلک کر سینے پر آ گئی۔

"اچھا؟" میں بھی اس کے قریب ہی کہنی کا سہارا لے کر لیٹ گیا۔

"اگر آپ کہیں چلے گئے تو میں نہیں جانتی میں کر بیٹھوں گی"! وہ اپنے گھنے بالوں کے گچھے بنا کر مجھے کوڑے مارنے لگی۔

"مثال کے طور پر تم کیا کر بیٹھو گی؟" میں نے اسے یوں ہی تنگ کرنے کے لیئے پوچھا۔

"خودکشی۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے سگریٹ کا لمبا سا کش اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور برا سا منہ بنایا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔؟" ریشماں نے پوچھا

"جو تم ان بالوں سے کیا کرتی ہو!" میں نے بالوں کے گچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان کے خوابوں کے محلوں کی تکمیل ہونے لگتی ہے عین اس وقت کوئی چیز بجلی بن کر گر پڑتی ہے اور یہ ریت کے گھروندے مسمار ہوجاتے ہیں۔ مجھے اچانک دو مہینے کے لئے ریشماں سے دور جانا پڑا۔ اس نے بڑی حیل وحجت کے بعد مجھے دو ماہ کی اجازت دے دی اور یقین دلایا کہ اگر میں نے اس سے ایک بھی دن زیادہ دیر لگائی تو وہ جان دے دے گی۔ میں نے اس سے وعدہ کرلیا اور چلا گیا۔

میں ریشماں سے اتنی دور ہونے پر بھی بہت نزدیک تھا۔ دن رات ریشماں کا تصور میرے دماغ میں لہراتا رہتا میں خوابوں میں اس کے لئے نازک نازک گجرے تیار کرتا اور اسے بطور تحفہ دے کر بہت خوش ہوتا

سگرٹ سلگاتے وقت مجھے ریشماں کا خیال ضرور آتا میں کبھی کبھی خلا میں دائرے بنا بنا کر اس کی طرف پھینکتا اور خلا میں ابھرے ہوئے ریشماں کے خیالی نقوش بہت برا سا منہ بنا لیتے اور پھر اس طرح منہ بنانے کے بعد کمرہ ریشماں کے لطیف قہقہوں سے دیر تک گونجتا رہتا کبھی کبھی میں حلقے بنا بنا کر دیوار کی طرف پھینکتا دھوئیں کا نازک سایہ چند لمحوں تک دیوار پہ ہلکے ہلکے تیرتا رہتا یہاں تک کہ دیوار کی سفیدی اسے پوری طرح سے جذب کر لیتی تم شاید اسے جنون کہو گے۔ اول درجے کا پاگل پن۔ تمھارے الفاظ میں بڑی حد تک صداقت ہو گی لیکن انسان محبت میں کیا کچھ نہیں کر بیٹھتا۔

دو مہینے گزر گئے لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی میرا کام پورا نہ ہوا۔ مجھے مجبوراً دو دن اور رکنا پڑا۔ میرا دل ریشماں کے دیدار کے لیے ترس گیا تھا جونہی میرا کام ختم ہوا میں ریشماں سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ تمام سفر میں سوچتا رہا مجھے رہ رہ کر ریشماں کے آخری الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اگر اس نے سچ مچ خودکشی کر لی تو .... تمام سفر میں مجھے محسوس ہوتا رہا جیسے میرا جسم کباب کی طرح بھنا جا رہا ہو۔ سارے دماغ میں ایک کھلبلی سی مچی رہی۔ جب میں گاؤں کے نزدیک پہنچا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں دماغ میں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں کسی نے مجھ سے کہا۔ "ریشماں نے خودکشی کر لی"

میرے دماغ میں کوئی چیز بارود کے بھبکے کی طرح اڑ گئی۔ ریشماں نے خودکشی کر لی! میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا، سر چکرانے لگا۔ میں نے ایک درخت کا سہارا لیا اور چپ۔ لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اچانک دیوانوں

کی طرح ریشماں کے گھر کی طرف بھاگا۔

میں ہانپتا ہوا ریشماں کے گھر پہنچا۔ باہر گاؤں کے کچھ لوگ جمع تھے۔ ان کی پرواکئے بغیر میں نے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ دروازہ چٹاخ سے کھل گیا۔ چٹاخ کی آواز نے میرے جنونی دماغ کو بیدار کر دیا۔ مجھے اتنا سا احساس ہوا گویا یہ آواز ریشماں کو جگا نہ دے لیکن ریشماں —— اس پر ان حقیر آوازوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ موت کا دیوتا اسے اپنے سنہری رتھ میں بٹھا کر لے گیا تھا! وہ میرے انتظار میں ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے عروسی جوڑا پہن رکھا تھا اور اس کے چاروں طرف پھول بکھرے تھے اور اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک خوبصورت ہار تھا اور اس نے بالوں میں بنفشہ کے اکا سنی پھول ٹانک رکھے تھے۔ اس کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں جیسے وہ کسی کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہو...... کتنی شاہانہ موت تھی! وہ میرا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اس کی موت کا ذمہ دار میں تھا، میں! وہ اس موت میں بھی ایک جیتا جاگتا شاہکار تھی —— صرف اس کے عنابی ہونٹ پیلے پڑ گئے تھے۔

اس کے تکیے کے نیچے ایک خط تھا! وہ آج بھی میں سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ اسے ابھی سناتا ہوں۔ کس قدر لافانی پیار اور محبت جھلکتی ہے اس خط سے! لکھا تھا:

میرے خوابوں کے دیوتا پرویز!

تمھاری راہ میں بچھی ہوئی آنکھیں پتھرا کر رہ گئی
ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تم کبھی نہیں آؤ گے جدائی
کا ایک ایک لمحہ میرے لئے عذاب بن گیا ہے....

یہ کیا بدتمیزی ہے! تم ہنستے چلے جا رہے ہو شاید — شاید اس لئے
کہ خط پرویز کے نام ہے اور — اور میرا نام جاوید ہے!!

فلمی دوستی

احمد جمال پاشا کے نام

برٹ سے میری پہلی ملاقات شملہ کے ہسپتال میں ہوئی جہاں میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے ملنے گیا تھا۔ برٹ ایک معمولی اپریشن کے لئے لایا گیا تھا۔ وہ ایک مضحکہ خیز انداز سے گھٹنوں کو پکڑے اسٹریچر ٹرالی میں بیٹھا ہوا تھا جسے نرس ہسپتال کی مختلف کاریڈوروں میں سے ڈھکیلے لے جا رہی تھی۔ وہ دیکھنے والوں کی طرف عجب شکلیں بنا کر ہمدردی طلب کر رہا تھا اسٹریچر ٹرالی کو دیکھ کر آپریشن روم میں سے ڈاکٹر نے دروازہ کھولا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ میں قینچی تھی اور دوسرے ہاتھ میں سرجیکل چھری۔

برٹ چلا اٹھا

"ارے یہ کہاں کا مقابلہ جائز ہے؛ آپ لوگ تو قینچی چھریوں سے لیس ہیں اور میں بالکل نہتا۔"

اس کے بعد برٹ سے میری دوستی ہونی لازمی ہوگئی۔ اپریشن روم سے باہر نکلنے پر جب میں نے ہسپتال آنے کا سبب پوچھا تو اس نے نہایت بھولے پن سے جواب دیا۔

"سگ لیلیٰ!" اور وہ رومال سے جھپکر کو پونچھنے لگا۔ "معلوم نہیں مجنوں کی لیلیٰ کے ہاں کس قسم کے کتے ہوں گے۔ لیکن میری لیلیٰ کے ہاں السیشین ہے جو بھونکتا بعد میں ہے اور اپنے پنجے سینے میں پہلے گاڑ دیتا ہے!

"لیلیٰ کے ساتھ ساتھ یہ کتے بھی ماڈرن ہوگئے ہیں!"

میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ برٹ یہ سن کر بے اختیار ہنس دیا اور ہم دونوں دوست بن گئے۔

برٹ واقعی بہت دلچسپ تھا وہ اکثر اپنے والد صاحب کے انتقال کا قصہ سنایا کرتا۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کے والد صاحب نے دوسری شادی کرلی اس سے اسے مجبوراً دو عدد بھائی اور ایک عدد بہن برداشت کرنی پڑی۔ جب والد صاحب نے محسوس کیا کہ وہ شاید جلد ہی عالم فانی سے کنارہ کش ہو جائیں گے تو انہوں نے برٹ کی سوتیلی ماں کو بلایا اور کہنے لگے۔

"ماما" وہ اکثر اپنی دوسری بیوی کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے "ماما اب میرا کچھ بھروسہ نہیں اس لئے میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد میری جائداد میں سے پانچ ہزار روپے برٹ کو دیے جائیں گے۔"

ماما جھنجھلا کر بولیں۔ "ایک بھی پیسہ بچا تو کہنا اس سے تو اچھا ہے کہ یہ پانچ ہزار روپے فرینک کو دے دو!"

"میری سونے کی گھڑی اور پارکر فونٹن پن جارج کو دے دینا۔"

"جارج کو! وہ ابھی سے ان چیزوں کو کیا کرے گا! اس سے اچھا ہے کہ تم لزی کو دے دو۔!"

"اور ایک سو روپیہ مارتھا کو۔"

"لو اور سنو! مارتھا کو! ایک ملازمہ کو! اس سے تو اچھا تھا کہ یہ رقم تم چرچ کو خیرات میں دیدیتے!"

"دیکھو ماما!" برٹ کے والد صاحب نے تکیئے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "مر میں رہا ہوں تم نہیں!"

میں نے ایک دن برٹ سے پوچھا۔ "تمھاری ہابی کیا ہے؟" وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا — "لکھنا پڑھنا لیکن یہ اب سب کچھ چھوٹ گیا ہے!" میں نے پوچھا "کیونکر" تو وہ کچھ ٹال سا گیا مجھے بعد میں برٹ کے دوست ٹونی سے پتہ چلا کہ اس نے ایک بار ایک مشہور رسالے کو ایک مقالہ بعنوان "میں کیونکر زندہ ہوں" بھیجا۔ یہ اس کی کئی مہینوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ خلاف از توقع یہ مقالہ مدیر رسالہ کے شکریہ کے ساتھ واپس لوٹا دیا گیا لیکن سب سے پریشان کن تو وہ چند سطریں تھیں جو اس معذرتی خط میں درج تھیں۔ لکھا تھا کہ ادارہ اس مقالے کو چھاپنے سے قاصر تھا۔ رہا سوال اس بات کا کہ "میں کیوں کر زندہ ہوں" تو مدیر اعلیٰ کا فرمان تھا کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ مقالہ ذاتی طور پر دیئے جانے کی بجائے بذریعہ ڈاک بھیجا گیا تھا!

ظاہر تھا کہ اس کے بعد ایک اچھے بھلے ادیب کا پڑھنا لکھنا چھوٹ جانا

قطعی طور پر غیر ممکن نہ تھا!

اس کے علاوہ برٹ کا حسنِ مذاق بہت شائستہ تھا۔ ایک دن زبان کے بارے میں بحث چل رہی تھی کسی نے پوچھا "آخر مادری زبان کی وجہ تسمیہ کیا تھی!"

جواب ملا۔

"مادری زبان کو مادری اس لئے کہا جاتا ہے کہ بے چارے والد صاحب کو آخر بولنے کا موقع ہی کب ملتا ہے!"

برٹ پنجابی کرسچین تھا۔ اس کے ماں باپ ایک عرصہ تک کیلی فورنیا کے باغیچوں میں سنگترے توڑ توڑ کر ڈالروں سے جیبیں بھر کر ہندوستان لوٹ آئے تھے۔ برٹ اب کانپور میں ریلوے ملازم تھا۔ وہ شملہ اس پختہ ارادے سے آیا تھا کہ جب وہ واپس ڈیوٹی پر کانپور جائے گا تو اس کے ساتھ مسز برٹ ضرور ہوں گی۔ اس نے بتایا کہ وہ جب بھی "ڈبل" ہونے کی منزل مقصود کے قریب پہنچا، کوئی نہ کوئی رقیب پیدا ہو گیا اس لحاظ سے اسے اردو شعراء سے حقیقی ہمدردی تھی کیوں کہ بقول برٹ وہ ایک ہی کشتی میں سوار معلوم ہوتے تھے۔

دن میں درجنوں بار مال روڈ کا چکر لگانا برٹ کا معمول ہو چکا تھا وہ مجھے بھی اکثر اپنے ساتھ گھسیٹ لیتا وہ مال روڈ پر رنگین کپڑوں میں ملبوس چھلکتی ہوئی جوانیوں کو دیکھتا تو ان چھٹیوں کے بعد مسز برٹ کو ساتھ لے کر جانے کے ارادے اور بھی تقویت حاصل کرتے لیکن جیسے کہ برٹ نے

بتایا تھا لیلیٰ کی تلاش میں ابھی تک "سگِ لیلیٰ" سے واسطہ پڑا تھا یا ایک امریکن نیگرو لڑکی سے!

برٹ کا کہنا تھا کہ ایک بار تنہائی سے اکتا کر اسے قلمی دوستی کا شوق چرایا اس نے ایک ادارے سے پتے منگوائے اور بہت سوچ سمجھ کر اس نے ایک امریکن لڑکی سے خط و کتابت کرنی شروع کر دی لیکن اتفاق سے وہ امریکن نیگرو نکلی اب برٹ کا جتنا شوق کم ہوتا جا رہا تھا اتنی ہی اس لڑکی کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی!

⁂ ⁂ ⁂

ایک دن میں کلب کے لاؤنج میں یونہی کھڑا تھا دفعتاً لیڈیز روم میں ہنگامہ سا ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ حضرت برٹ نہایت بے رحمی سے کمرے میں سے نکالے جا رہے تھے اور ایک خوب صورت محترمہ اپنی مہین آواز میں زوروں سے چلّا رہی تھیں ـــــ "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ کمرہ صرف عورتوں کے لئے ہے"

برٹ نے ڈان جوآنا انداز سے کورنش بجا لاتے ہوئے کہا۔ "محترمہ! میں ناچیز بھی عورتوں کی خدمت کے لئے حاضر ہوں!" پیشتر اس کے کہ وہ محترمہ اپنے دہن مبارک سے کچھ اور ارشاد فرمائیں، برٹ نے مجھے دیکھ لیا۔

"آخاہ! آپ؟" اور پھر اس نے محترمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے یہ ملاقات ملتوی کرنے پہ بہت افسوس ہے، خیر زندگی رہی تو ملاقات

ہو گی ہی۔"

ذرا دور جانے پر میں نے برٹ سے کہا۔ "بھئی مجھے افسوس ہے میں خواہ مخواہ مخل ہوا!"

"خدا کی قسم تم عین موقع پر کام آئے۔ یہ لڑکی ہنیں ٹپاخہ ہے!"

"کیا یہ تمھاری لیلیٰ ہے؟"

"ہنیں بھئی۔ یہ لیلیٰ کا نیا ماڈل ہے!"

اب آپ 'ٹپاخہ' کی تعریف بھی سن لیجئے۔ چھریرا بدن جس پر بلاؤز اور اسکرٹ عین فٹ آتے تھے۔ آواز میں ایک بے پناہ لوچ اور سپی نما آنکھیں جو ہمیشہ خلا کی گہرائیوں میں کچھ ڈھونڈا کرتیں۔ برٹ کو اس کی یہ ادا لے جلد بھا گئی تھی۔

"آؤ لاونج میں چلیں!" لاونج میں جا کر کچھ دیر کے لئے رسالے، میگزین الٹ پلٹ کئے، کچھ نئے شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں دیکھیں۔ اتنے میں قریب کی میز سے ہی ایک ضعیف العمر صاحب کی آواز سنائی دی، ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرما رہے تھے۔

"آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ میں آج اپنی نوّے ویں سالگرہ مناؤں گا۔" واقعی وہ اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اتنی عمر کے ہرگز نہ معلوم ہوتے تھے خدا کی قدرت سے ابھی تک دانت اپنی جگہ پر کھڑے تھے صرف آنکھوں پہ ایک چشمہ تھا یا پھر برنارڈ شا قسم کی سفید داڑھی، جسم کی ہڈیاں بھی ابھی توانا تھیں۔ برٹ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بزرگوار آپ شکل و صورت سے تو بالکل اتنی عمر کے معلوم نہیں ہوتے۔"

"غدر کے تین سال بعد کی پیدائش ہے۔ میرزا غالب کو ان آنکھوں نے دیکھا اور ان کانوں نے خود سنا ہے۔"

"کمال ہے! حضرت آپ کی عمر کا کوئی خاص راز ہے؟"

"کھلی ہوا اور کامیاب ازدواجی زندگی! جب میری شادی ہوئی تو میری بیوی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ لڑنے جھگڑنے کی بجائے ہم دونوں میں جو کوئی بھی غلطی پر ہوگا وہ غصہ کم کرنے کے لئے باہر کھلی ہوا میں گھوم لیا کرے گا۔ نتیجہ کے طور پر میں پچھلے ۷۵ سال سے کھلی ہوا میں گھوم رہا ہوں۔"

"مبارک ہو آپ کی سو دیں سالگرہ! میری دلی دعا ہے کہ آپ زندگی کے باقی دن بھی کھلی ہوا میں گزاریں۔" میں نے کہا۔

بزرگوار صاحب نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"بھاگ چلو، ابھی ابھی وقت ہے!" برٹ نے رائے دی۔

"کہاں؟ کھلی ہوا میں۔"

ہم دونوں اٹھ کر کلب کے دوسرے کونے میں چلے گئے جہاں ایک کمرے میں شراب بندی پر زور شور سے لیکچر ہو رہا تھا۔ "حضرات! میں آپ صاحبان کا قیمتی وقت زیادہ نہ ضائع کرتے ہوئے ایک تجربہ کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ شراب کس قدر مہلک زہر ہے۔ میرے سامنے یہ دو گلاس ہیں ان میں سے ایک میں پانی ہے جس میں یہ ایک کیڑا ہے جو کئی دنوں تک اس پانی میں نہایت خوش و خرم رہ چکا ہے اب میں آپ کے سامنے اسے دوسرے گلاس میں ڈالتا ہوں جس میں وہسکی ہے۔ لیجئے!—

اور سچ مچ جب کیڑا وہسکی کے گلاس میں ڈالا گیا تو وہ کچھ دیر تک کلبلایا، تڑپا یا اور پھر مر گیا۔

ہر کوئی اس تجربے سے بے حد محظوظ ہوا۔ برٹ نے لپک کر پوچھا "یہ کون سے برینڈ کی وہسکی ہے مجھے بھی پیٹ کے کیڑوں کی سخت شکایت ہے!"

"آؤ برٹ اب چلو بھی!" مجھے لیکچرار صاحب پر سخت رحم آرہا تھا۔ "میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

ہم دونوں نے ڈرائنگ روم میں جا کر ایک کونے والی میز منتخب کر لی۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ برٹ چلا اٹھا "ارے وہ دیکھو پٹاخہ!"

وہ بھاگ کر اس کی طرف چلا گیا۔ کیا جانے کیا کہہ سن کر وہ اسے پھسلا کر اپنی میز پر لے آیا۔ اب تو اس کے چہرے پر ذرا بھی غصے کے آثار نہ تھے۔ اس نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے میرا عزیز ترین دوست، پال اور یہ ...... ارے میں ان کا نام تو پوچھنا بھول ہی گیا۔"

"میرا نام ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ہے، اور آپ کا نام؟" وہ بہت اچھے موڈ میں معلوم ہوتی تھی۔

"وہ بھی اسی میں دیکھ لیجئے گا۔ ویسے خاکسار کو برٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں!"

برٹ اس لڑکی کے جواب سے بے حد محظوظ ہوا۔ مجھے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنا رہا سہا دل بھی اسے ہار گیا ہو۔

"میرے خیال میں آپ کا نام 'پٹاخہ' رکھ دیا جائے۔"

"لیکن "پی" کے نیچے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نہ دیکھئے گا۔ ویسے بھی بُوالی کافی دور ہے! میرا نام ڈیزی ہے۔"

"آخاہ، کتنا پیارا نام ہے، ڈیزی۔ ڈے، زی!" اس نے لفظی چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

اتنے میں بیرا آرڈر لینے آ گیا۔ اس نے ہم سب لوگوں کے ہاتھ میں مینو کارڈ تھما دیا۔ تاکہ ہم آرڈر کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ اور وہ خود ایک دوسری میز پر بل پر دستخط کرانے چلا گیا۔

"آپ کیا لیجیے گا؟" برٹ نے ڈیزی سے پوچھا

"مچھلی، کباب یا اپنے حسن اور صحت کے لئے کوئی خاص غذا استعمال کرتی ہیں؟"

"میں صرف براؤن بریڈ اور پانی کا استعمال کرتی ہوں۔"

"واللہ کمال ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ کا ارادہ تاحیات براؤن بریڈ اور پانی پر ہی گزر کرنے کا ہے؟"

"ابھی تک تو یہی خیال ہے!"

"بہت خوب!" برٹ نے کہا۔ "اس صورت میں تو ہم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیئے۔ کچھ میرے بھی ذرائع آمدنی اتنے وسیع نہیں۔"

اتنے میں بیرا آ گیا۔ برٹ نے ڈیزی کی باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ہم سب کے لئے فرائیڈ فش اور چپس کا آرڈر دے دیا

تھوڑی دیر بعد بیرا کھانے کی چیزیں لے آیا۔

"کیوں بیرا" برٹ نے پوچھا "یہ مچھلی پکانے سے پہلے دھوئی بھی گئی ہے یا نہیں؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں" ڈیزی بول اٹھی "بھلا مچھلی جس نے ساری عمر پانی میں ہی گزاری ہو، اس کے دھونے کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے!"

ہماری میز سے قہقہے بلند ہوئے۔ آس پاس کے لوگ ہماری طرف دیکھنے لگ گئے۔ اتنے میں آرکسٹرا بجنے لگا۔ برٹ اور ڈیزی اس جھینپ کو ٹالنے کے لئے رقص کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈائیننگ ہال کی ڈھکی ہوئی روشنیوں میں ڈیزی واقعی بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ برٹ نے ڈیزی کو کمر سے اس طرح پکڑا ہوا تھا گویا وہ کوئی چینی گڑیا ہو۔ برٹ کی محبت بھری نگاہیں ڈیزی کے ملائم اور دلکش چہرے پر جمی تھیں اور وہ دونوں اس طرح سے رقص کر رہے تھے گویا وہ فلور پر نہیں ہوا کی لہروں پر اڑے جا رہے ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂

برٹ اب کم نظر آنے لگا تھا۔ اس کا بیشتر وقت اب ڈیزی کے ساتھ گزرتا۔ کبھی وہ جاگھو راؤنڈ پر ہاتھ جھلاتے ملتے۔ کبھی وہ وائلڈ فلور مِل کنفری یا کریگ بنبوں کے پاس سائیکلوں پر پکنک کا سامان باندھے نظر آتے یا پھر گلین یا جیڈوک فالز کے پاس پانی میں پاؤں ڈالے قہقہے لگاتے ملتے۔ وہ چند ہی دنوں میں اتنے گھل مل گئے تھے کہ مجھے یقین تھا کہ ڈیزی بہت جلد ہی مسز برٹ بن کر کانپور پہنچ جائے گی۔

٭ ٭ ٭

چار پانچ مہینے بعد میں کناٹ پلیس کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ مجھے اچانک محسوس ہوا گویا ڈیزی میرے سامنے سے گزر گئی ہو۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو برٹ سے کسی طرح بھی مشابہہ نہ تھا۔ وہ دونوں ایک فیملی کیبن میں گھس گئے۔ میں نے سوچا شائد مجھے پہچاننے میں غلطی ہو گئی ہو۔ میں کافی بنانے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن نہ جانے یہ خیال میرے دماغ میں کیوں کر آ رہا کہ وہ ڈیزی ہی تھی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے سامنے برٹ کو کھڑے پایا۔ وہ کچھ سست سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی قمیص کے کالر کھلے تھے اور اس کی ٹائی کی ناٹ بہت ڈھیلی بندھی ہوئی تھی۔ وہ منٹ منٹ پر قہقہے برسانے والا چہرہ بجھا بجھا سا نظر آتا تھا۔

"ارے برٹ! آ دبیٹھو!" میں نے اسے زبردستی کرسی پر ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ "واہ حضرت! شادی بھی ہو گئی اور ہمیں انوی ٹیشن تک نہ بھیجا!"

برٹ خاموش رہا

"ارے ڈیزی کو کہاں چھوڑ آئے یار!" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آئینہ میں صورت دیکھی ہے کیا؟ تم تو بالکل ان اشتہاروں کی طرح ہو گئے ہو استعمال سے پہلے، استعمال کے بعد! شادی سے پہلے شادی کے بعد!"

برٹ کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی توسیں ابھریں اور وہ میری طرف خاموش دیکھتا رہا۔

"آؤ چلو، ڈیزی کو بھی یہیں لے آئیں۔"

"ڈیزی میرے ساتھ نہیں ہے۔"

"اور وہ اس کیبن میں کون ہے؟"

"کہاں؟"

میں نے کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ برٹ نے گردن موڑ کر دیکھا

"ہاں، وہ ڈیزی ہی معلوم ہوتی ہے!" اس کا لہجہ نہایت سرد تھا۔

"معلوم ہوتی ہے، کیا مطلب؟ تمھیں نہیں معلوم ڈیزی یہاں ہے؟"

"نہیں!"

"عجب انسان ہو! اس کے ساتھ کیا تمھارے سالا صاحب ہیں؟"

"نہیں۔ اس کا شوہر!"

"اس ۔ کا ۔ شوہر!" میں نے حیرانی سے پوچھتے ہوئے کہا۔ "ڈیزی سے تمھاری شادی نہیں ہوسکی؟"

اور برٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا اس کا چہرہ نہایت غمگین تھا۔ مجھے اس پر ترس آرہا تھا۔ چند انسان پیدائشی طور پر ہی بدنصیب ہوتے ہیں شاید برٹ ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔

"اچھا ٹھاڈ" میں نے اس کا موڈ بدلنے کی خاطر کہا۔ "تو نہ سہی اور سہی اور نہ سہی اور سہی!"

اس کے ہونٹوں پر چند لمحوں کے لئے مسکراہٹ پھڑپھڑائی، اور پھر وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"آؤ برٹ کافی پیو!" اور میں نے بیرے سے ایک اور کافی لانے

کے لئے کہدیا۔ چند ہی منٹوں میں کافی آگئی اور برٹ پینے لگا۔

"میں ذرا یہ خط ختم کروں!" میں نے جیب میں سے دو خط نکالے۔ ایک خط میں نے ایک دوست کو لکھا تھا اور دوسرا خط ابھی نامکمل تھا۔

"تم یہ خط کسی لڑکی کو لکھ رہے ہو؟" برٹ نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ وہ شاید میری مسکراہٹ اور میرے انداز سے پہچان گیا تھا۔

"کیوں مجھے تم سے محتاط ہونے کی ضرورت ہے ویسے یہ خط میں اپنی منگیتر کو ہی لکھ رہا ہوں"۔

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا" برٹ مسکرادیا۔ "حضرت کا چہرہ دیوانی کا انار کیوں بنا ہوا ہے"۔

میں خوش تھا کہ برٹ میں سویا ہوا حسن مذاق پھر سے جاگ اٹھا تھا۔

میں نے خط ختم کرنے کے بعد نہایت غور سے پڑھا اور پھر لفافے پر پتہ لکھنے کے بعد اشارے سے بیرے کو بلایا اور اسے دونوں خطوط پوسٹ کرنے کے لئے پیسے دینے ہی والا تھا کہ برٹ کا چہرہ ایک دم زرد ہوگیا اور وہ میری طرف ایک عجب پراسرار انداز سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مسکرا کر بیرے سے کہا۔

"یہ خط تو بعد میں پوسٹ ہوں گے، پہلے دو کافی اور لے آؤ"۔

جب بیرا چلا گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ "یار یہ خط تمھیں اپنے ہاتھوں سے ہی پوسٹ کرنے چاہئیں"۔

"کیوں؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ برٹ ایک لمحے کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا۔

"میں نے ڈیزی کو اسی طرح کھو دیا"

"وہ کیونکر!"

"تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ایک امریکن لڑکی سے میری قلمی دوستی تھی"

"وہی نیگرو لڑکی۔"

"ہاں وہی۔! وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ میں نے ہمیشہ کے لئے سلسلہ ختم کرنے کے لئے اسے ایک سخت خط لکھا تھا۔ ادھر میں نے ڈیزی کو ایک نہایت پیار بھرا خط لکھا تھا اور اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ میں نے یہ دونوں خط اپنے بیرے کو پوسٹ کرنے کے لئے دیئے تھے۔ اتفاق سے مجھ سے ٹکٹ لگانے میں غلطی ہو گئی میں نے امریکا جانے والے خط پر پندرہ پیسے کے ٹکٹ اور لڑکی کے خط پر ڈیڑھ روپے کے ٹکٹ لگا دیئے۔ دو چار دن بعد ایک دن باتوں باتوں میں بیرے نے مجھے اس غلطی کی طرف توجہ دلائی۔ کہنے لگا صاحب میں نے سب ٹھیک کر دیا۔ اور جب میں نے پوچھا کہ کیا ٹھیک کر دیا تو اس نے کہا کہ میں نے خطوں پر پتے تبدیل کر دیئے تھے!

میں سکتے میں آ گیا۔" تو اس طرح سے ڈیزی سے غلط فہمی ہو گئی۔"

"ہاں میں بعد کوشش کرنے پر بھی اسے اطمینان نہ دلا سکا اور اس نے جلدی میں شادی کر لی۔"

"بڑی ٹریجیڈی ہے!" میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس نیگرو لڑکی کا کیا ہوا؟"

"یہی تو مشکل ہے!" اس نے جیب سے ٹیلی گرام نکالتے ہوئے کہا۔

"وہ کل یہاں پہنچ رہی ہے!"

بیرا کافی لا چکا تھا اور برٹ نہایت حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا گویا بیروں کی صنف اسی حقارت کے قابل ہے۔

ایکسپرٹ

مجھے کبھی آفس دیر سے پہنچنا اچھا نہیں لگتا اور اسی لئے نوکر کو ہدایت ہے کہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ میز پر آجایا کرے تاکہ اس سے فارغ ہو کر ساڑھے نو بجے تک دفتر کے اوقات سے پہلے ہی دفتر پہنچ سکوں۔ صبح کا وقت کچھ اس طرح نپا تلا ہوتا ہے کہ اس میں وقت ضائع کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بچوں کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اسکول پہنچنا ہوتا ہے اور ان کی بس ۸ بجے آجاتی ہے۔ ان کے بس کی آمد میرے بیدار ہونے کا اعلان ہے۔ اگر بس کی آمد میں کچھ دیر ہو بھی جائے تو ریڈیو سیلون اپنی بین بجا کر فرمائشی گانے شروع ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ آٹھ بج کر دس منٹ پر میں باتھ روم میں موجود ہوں۔ آٹھ بج کر بیس منٹ پر میری بیوی شوبھا کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"بیر سنگھ ناشتہ لگاؤ۔ صاحب غسل خانے سے آ گئے!" اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے جب ریڈیو سیلون اپنی فرمائشی بین بجا کر پروگرام ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے تو میں تیار ہو کر کھانے والے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں۔

آج صبح جب میں ساڑھے آٹھ بجے حسب معمول کھانے کے کمرے میں پہنچا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ ناشتہ لگنا تو درکنار وہاں تو ابھی میز پر پلیٹیں بھی نہیں لگی تھیں ہاں گلدان میں خوش ترتیب لگے ہوئے پھولوں سے شوبھا کی کارگزاری ضرور نظر آ رہی تھی۔ شوبھا چند دنوں سے پھولوں کو جاپانی ڈھنگ سے سجانے کے طریقے سیکھ رہی تھی وہ اس موضوع پر چند کتابیں لائبریری سے لے آئی تھی اور میں نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے پچھلے دنوں اسے جاپانی سفارت خانے کے کمرشل سکریٹری کی بیوی سے ملوا بھی دیا تھا۔ میں چند لمحوں تک گلدان میں لگے ہوئے پھولوں کو دیکھتا رہا لیکن پھر مجھے یکایک احساس ہوا کہ دیر ہو رہی تھی۔ شوبھا بھی ابھی تک کمرے میں نہ آئی تھی میں نے بے صبری سے اپنے نوکر بیر سنگھ کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

میں کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آیا۔ بیر سنگھ بالکل لاپتہ تھا میں باورچی خانے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ سامنے سے شوبھا ہاؤس کوٹ پہنے ہاتھ میں ٹرے اٹھائے آ رہی تھی۔

"بیر سنگھ تو رات کو ہی چھٹی کر گیا!"

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ان نوکروں کا بھی آج کل کیا ٹھکانہ ہے! آئے اور گئے!" شوبھا نے اپنی خاص ادا سے ہاتھ گھماتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ پھر کوئی اور انتظام کرتے ہیں۔" میں شوبھا کے ساتھ واپس کھانے کے کمرے میں آگیا۔

"آپ بیٹھیئے۔ میں ابھی ناشتہ تیار کرتی ہوں۔" اور وہ کہہ کر الماری کھولنے لگی۔

اس نے الماری میں سے الیکٹرک ٹوسٹر نکالا اور قریبی میز پر رکھدیا۔ پھر وہ دوسری الماری کی طرف گئی اور اس میں سے ایک ایک کر کے پلیٹیں، پیالیاں، چمچے، چائے دانی دودھ دانی وغیرہ نکال کر میز پر لگانے لگی۔

"شوبھا۔ آج یہ پھول تو تم نے بڑی محنت سے لگائے ہیں!" شوبھا کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے گھوم کر نہایت پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر وہ لپک لپک کر پھرتی سے میز لگانے لگی۔

⁂ ⁂ ⁂

میں شوبھا کی تمام حرکات کا جائزہ بیتیہ ور نظروں سے لے رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شوبھا الماری میں سے ایک پلیٹ نکالتی اسے میز پر لگاتی پھر دراز میں سے ایک چمچہ نکالتی اسے میز پر لگا دیتی۔ پھر وہ واپس الماری میں سے پرچ اور پیالی نکالتی۔ میں نہ جانے کتنے ہی کارخانوں میں "حرکت و وقت" کے بارے میں مشورہ دے چکا تھا۔ فلاں مشین فلاں جگہ پر ہونی چاہیئے تاکہ کام کرنے والے کو اپنی مشین پہ پرزے بنانے کے لئے ڈھلے ہوئے حصے لینے دور نہ جانا پڑے، یا پھر فلاں مشین اتنی اونچی ہو تاکہ کام کرنے والے کو بار بار جھک کر قبل از وقت تھکنا نہ پڑے یا پھر کسی دفتری کارروائی کی تکمیل میں غیر ضروری حصے کاٹ دیئے جائیں تاکہ کام جلد سے جلد اور کم سے کم خرچ میں سرانجام پا جائے۔ کبھی کسی مقصد کے لئے نئے نئے فارمولے

تشکیل دینا تاکہ کم سے کم وقت میں اور کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات مہیا کی جا سکیں۔ میری تجاویز سے پچاسوں کارخانے اور دفتر اپنے نظام اور صنعتی پیداوار میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر کے لاکھوں روپے بچا چکے تھے، اور آج میں اپنی ہی نگاہوں کے سامنے اور اپنے ہی گھر میں ان تمام اصولوں کا خون ہوتے دیکھ رہا تھا جن کی پیروی کی میں پرزور سفارش کیا کرتا۔

میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا وقت نوٹ کیا۔ شوبھا کو میز لگاتے تین منٹ چالیس سیکنڈ کے لگ بھگ ہو چکے تھے، شوبھا نے دوسری الماری میں سے چائے کی پتی نکالی اور چائے کی کیتلی اور دودھ دانی ٹرے میں رکھ کر اسے پھرتی سے رسوئی کی طرف لے گئی دو ہی منٹ بعد وہ چائے کا پانی رکھ کر شکردان واپس کھانے کے کمرے میں لوٹا لائی اس نے الماری میں سے چینی نکالی اور شکردان میں ڈال کر میز پر رکھ دی، پھر وہ بھاگی بھاگی واپس رسوئی میں گئی اور کیتلی میں چائے ڈال کر لے آئی۔

"لیکن وہ دودھ!"

"دیکھئے اسٹوو پہ رکھ آئی ہوں۔ جب تک چائے بھیگے گی دودھ بھی گرم ہو جائے گا!" یہ کہہ کر وہ رسوئی میں دودھ لانے کے لئے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دودھ لے کر آئی۔ ریفریجریٹر کھول کر مکھن نکالا تو مکھن کا چمچہ لینے کے لئے رسوئی چلی گئی وہاں سے چمچہ لے کر لوٹی تو اسے رسوئی سے ڈبل روٹی لانی یاد آ گئی۔ رسوئی سے لوٹ کر آئی تو اس نے ٹوسٹر کا تار پلگ میں لگا دیا اور بیٹھ کر ٹوسٹ سینکنے لگی۔

میں ان تمام حرکات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شوبھا کو میز لگانے اور ناشتہ رکھنے کے لئے رسوئی سے کھانے کے کمرے تک گیارہ چکر پلیٹوں والی الماری کے سات چکر، اسٹور والی الماری اور ریفریجریٹر سے میز تک کے تین چکر لگانے پڑے۔ ان حرکات میں سترہ منٹ بیس سیکنڈ صرف ہوئے تھے اور شوبھا نے اس دوران میں ۱۲۰ گز فاصلہ طے کیا تھا۔ اسی اثنا میں تقریباً پندرہ منٹ اسٹوو جلا ہوگا اور سات منٹ کے قریب بجلی خرچ ہوئی ہوگی۔

⁂

جب شوبھا میرے لئے چائے بنا چکی تو میں نے شوبھا سے اپنے اس حساب کا ذکر کیا۔

"ارے!" اس نے حیرانگی سے ایک ہاتھ گالوں پر رکھتے ہوئے کہا "میرے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔"

"میڈم" میں نے کہا۔ "یہ جو تمام کمپنیاں مجھے بطور ماہر مشاہدہ حرکت و وقت اور ماہر بچت وقت ہزاروں روپیہ فیس میں دیتی ہیں تو کیا وہ اتنے پیسے بھاڑ میں جھونکتی ہیں!" میں نے شوبھا پر رعب جماتے ہوئے کہا "میرے اتنے مشورہ کی فیس دو سو روپیئے ہے۔ جاؤ میں نے تمھیں معاف کیا۔"

"لیکن حضور نے مشورہ ابھی دیا ہی کب ہے مرض کی تشخیص کی ہے علاج تو نہیں بتایا!" شوبھا مسکرائی "علاج بتانے کی فیس تین سو روپیہ اور ہے!" اور میں نے ننگی سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ وہ معاف نہ کرسکیں گے؟" شوبھا نے التجا کا سوانگ

بھرتے ہوئے کہا۔

"غور کیا جائے گا! غور کیا جائے گا!" میں نے ایک پختہ کار جج کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اچانک میں نے گھڑی دیکھی، سوا نو بجے تھے۔

"لو شوبھا دیوی تمہاری وجہ سے آج پندرہ منٹ دیر سے پہنچوں گا۔ ان پندرہ منٹ کی قیمت بھی پچاس روپئے سے کم نہیں!"

"تو اسے بھی اسی معاف کرنے والے حساب میں شامل کر لیجئے!"

اور ہم دونوں کھکھلا کر ہنس دیئے۔

٭ ٭ ٭

شام کو دفتر سے آنے کے بعد میں نے ہمیشہ ورانہ اصولوں کے مطابق کام کئے جانے کی تفصیلات ایک کاغذ پر درج کیں اور میں نے ان تمام کاموں کو کم سے کم وقت میں سرانجام دینے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

(۱) وقت بچانے کے لئے الماری نمبر ا سے بجلی کی کیتلی نکال لی جائے۔ ورنہ پڑے پڑے یوں بھی پالش خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۲) رسوئی میں دودھ گرم کرنے کی بجائے بجلی کی کیتلی میں ہی ایک گلاس کیا دوسرے موزوں برتن میں دودھ ڈال کر گرم ہو سکتا ہے اس سے دودھ علیحٰدہ گرم کرنے کا وقت بچ سکتا ہے۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ انڈے ہمیشہ آملیٹ یا فرائی ہی کھائے جائیں۔ جب کبھی وقت بچانا درکار ہو تو انڈے اچھی طرح سے دھو کر چائے کے پانی

میں ہی ابالے جا سکتے ہیں۔

(۴) کیا وجہ ہے کہ مکھن کا چمچہ رسوئی میں رکھا جائے؟ کیا وہ دیگر چمچوں کے ساتھ کھانے والے کمرے میں سائیڈ ٹیبل کی دراز میں نہیں رکھا جا سکتا؟

(۵) ڈبل روٹی بریڈبِن میں ڈال کر ریفریجریٹر میں رکھی جا سکتی ہے۔ اس کا رسوئی میں ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اس طرح رسوئی تک کا ایک چکر بچے گا۔

(۶) اب اسٹوو جلانے کی ضرورت نہیں رہنی چاہیئے۔ مٹی کے تیل اور بجلی کے خرچ میں محض ڈیڑھ نئے پیسے کا فرق ہے۔ لیکن بجلی کی سہولت، وقت کی بچت کے حساب سے اس خفیف خرچ کا پلہ بھاری ہے۔

ناشتہ کے تمام کاموں کو کفایت شعاری اور آسانی سے نپٹانے کے لئے مندرجہ ذیل ترکیبیں زیر عمل لائی جائیں۔

(۱) بجلی کی کیتلی اور ٹوسٹر بیک وقت میز پر نکال کر رکھے جا سکتے ہیں۔

(۲) تمام پلیٹیں، پیالیاں اور چمچے ایک ہی بار میز پر نکال کر رکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ٹرے استعمال میں لائی جائے۔ یہ ٹرے بھی اسی الماری میں رکھی جائے جس میں چمچے پیالیاں اور پرچیں رکھی جائیں تاکہ ٹرے لانے اور لے جانے کے لئے رسوئی کا خالی چکر نہ لگے۔

(۳) ریفریجریٹر میں رکھا ہوا دودھ، مکھن اور انڈے ایک ہی بار میں نکالے جا سکتے ہیں دودھ ریفریجریٹر میں کسی اسٹین لیس اسٹیل (STAINLESS STEEL) کے گلاس میں رکھا جا سکتا ہے جو کہ فوری ہی بجلی کی کیتلی میں رکھا جا سکے۔

(۴) بجلی کی کیتلی کو پانی سے بھر دیئے اس میں پہلے دودھ کا گلاس رکھیے اور اسے

پلنگ کر دیجیے۔ ریفری جریٹر سے انڈے نکالنے کے بعد فوراً گرم پانی میں نہیں ڈالنا چاہئیں بلکہ جب دودھ گرم ہو جائے اور پانی جوش کھانے کے قریب ہو تو انڈے ڈال دینے چاہئیں۔ دودھ چونکہ رات بھر ریفری جریٹر میں رہا ہے اسے دوبارہ جوش دلانے کی ضرورت نہیں محض گرم کرنا ہی کافی ہوگا۔

(۵) اس اثنا میں نمبر ۳ اور نمبر ۲ عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ چائے کی پتی اور چینی بھی نکالی جا سکتی ہے۔

(۶) کیتلی میں پانی گرم ہونے پر چینی کی کیتلی کو کھنگالیے۔ یہی پانی چینی کے پیالوں کو دھونے کے کام بھی آسکتا ہے۔ اس کے بعد چائے کی پتی کیتلی میں ڈالیے اور جوش کھاتا ہوا پانی ڈالیے۔ چائے کو پانچ منٹ تک بھیگنے دیجیے۔

(۷) اس اثنا میں اب کیتلی کے بجائے ٹوسٹر کا تار لگا دیجیے اور ٹوسٹ سینک لیجیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی آپ کھانے والوں کو کارن فلیکس اور دودھ دے سکتی ہیں۔

(۸) جب یہ کورس ختم ہو جائے تو اس کے بعد آپ کھانے والوں کو فوراً ہی انڈے دے دیجیے۔ انڈے چھیلنے کے دوران آپ ٹوسٹوں پر مکھن لگا سکتی ہیں۔

ناشتہ بنانے کا کل وقت:۔ صرف سات منٹ ۳۰ سیکنڈ۔ سابقہ وقت میں ۶۶ فیصدی بچت، ناشتہ بنانے میں ۸۰ فیصدی دوڑنے بھاگنے کی بچت۔ ۱۳۸ گز کے بجائے اب صرف ۲۵ گز فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ اب کچن جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسٹوو جلانے کی دردسری سے چھٹکارا، تیل جلانے کے زہریلے دھوئیں اور بخارات سے نجات۔ کام میں صفائی۔

⁂ ⁂ ⁂

میں نے دو گھنٹہ کی مغز پچی کے بعد یہ ماہرانہ رپورٹ شوبھا دیوی کو پیش کر دی۔ وہ کہنے لگیں۔ "کاغذ پر تو یہ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ہاں عمل کی بات دوسری ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ مکمل ناشتہ صرف ساڑھے سات منٹ میں تیار ہو جائے!"

مجھے شوبھا کی اس دلیل پر غصہ آیا۔ لیکن بدھ، کرشن، یسوع مسیح اور گاندھی کی باتوں پر بھی پہلے کسے یقین آیا تھا!

اگلے دن صبح ہی گھڑی سامنے رکھ کر میں نے پورے ساڑھے سات منٹ میں ناشتہ تیار کر کے دکھا دیا۔ شوبھا قائل ہو گئی۔

لیکن کئی بار عمل کرنے پر بھی شوبھا بتلائی ہوئی ترکیب میں گڑبڑ کر جاتی ہے اور نتیجہ کے طور پر جب کبھی کم وقت میں ناشتہ تیار کرنا ہو تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہی پڑتی ہے۔

اجنبی

رام لعل کے نام

ابھی مشکل سے آٹھ بجے تھے لیکن ابر آلود آسمان کی وجہ سے آدھی رات کا گمان ہوتا تھا بارش کے چھینٹے کھڑکیوں کے شیشوں پر تال دے رہے تھے۔ کمرے میں لگے ہوئے پردے ہوا کے تند جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شیلا نے سویٹر بنتے بنتے ایک طرف رکھ دیا اور دروازہ بند کرنے کے لئے اٹھی۔

"تمہیں ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی انل؟"

انل نے جس کی تمام توجہ ہوائی جہاز کا ماڈل بنانے پر مرکوز تھی نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا "نہیں ممی" اس کی عمر مشکل ۸ برس کی ہوگی۔

"بالکل اپنے ڈیڈی کی طرح ہے!" شیلا کو انل میں اپنے مرحوم خاوند سریش کا خاکہ نظر آیا۔ وہ بھی تو اسی طرح ہر کام میں جٹ جایا کرتے تھے اور پھر انل کو بھی سریش کی طرح

ہوائی جہاز سے بے حد لگاؤ تھا لیکن شیلا کو اب ان ہوائی جہازوں سے سخت نفرت ہوگئی تھی!

وہ انل کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کا دلکش بیضوی چہرہ شدتِ جذبات سے روشن تھا۔ اسے انل پر بے حد ناز تھا۔ سریش کی موت کے بعد اسے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ کبھی کبھی سوچتی کہ وہ اس پراسرار مالی امداد کے بنا زندگی کے تھپیڑوں کا مقابلہ شاید نہ کر پاتی۔

اور اس کی نگاہیں گھومتی سجے ہوئے کمروں کی وسعتوں کو پار کرتی ہوئی انگیٹھی پر پڑے ہوئے بینک کی پاس بک پر آکر رک گئیں۔ یہ پاس بک آج صبح ہی آئی تھی اور جب اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کھولا تو اسے سو روپیے کے اندراج پر معمول کی طرح یقین نہ آیا۔ یہ رقم روشن سیاہی میں وہاں درج تھی اور اس کی آنکھیں اسے جھٹلا نہ سکتی تھیں۔

نہ جانے یہ رقم ہر مہینے باقاعدہ طور پر کون اس کے حساب میں جمع کرواتا تھا!
جب سریش کے مرنے کے چند مہینوں بعد۔ اس نے پہلی بار یہ رقم اپنے حساب میں درج ہوئی دیکھی تو اسے یقین تھا کہ بینک والوں سے شاید غلطی ہوگئی ہے لیکن پوچھنے پر بینک والوں نے اسے یقین دلایا کہ اس میں کوئی غلطی نہ تھی۔ اس نے بارہا یہ راز جاننے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

اس کے شوہر نے کوئی بہت بڑی رقم نہ چھوڑی تھی اور یہ بروقت مالی امداد بہت کارآمد ثابت ہوئی اس کے سسرال یا اپنے میکے میں سے کوئی ایسا نزدیکی رشتہ دار نہ تھا جو اس کی مدد کرتا۔ سریش حد سے زیادہ فراخ دل واقع ہوا تھا۔

اور شیلا نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ شاید کسی اچھے وقت سریش نے کسی اپنے دوست کو ادھار دیا ہوگا جواب رفتہ رفتہ لوٹایا جا رہا تھا لیکن اس گمنام طور سے کیوں؟ اور پھر پچھلے دو سالوں سے اسے یہ رقم نہایت باقاعدگی سے مل رہی تھی۔ سریش نے اتنی رقم کیسے ادھار دی ہوگی؟ اس میں ضرور کوئی راز تھا۔

"میں اپنے چھوٹے سے بابا کے لئے گرم گرم چاکلیٹ بنا لاؤں؟" اس نے انل سے پوچھا اور انل نے نگاہیں اٹھائے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

⁂

شیلا رسوئی میں انل کے لئے چاکلیٹ اور اپنے لئے چائے بنانے کے لئے چلی گئی لیکن جب وہ واپس آئی تو وہ انل کو بارش سے بھیگے ہوئے ایر فورس کی وردی پہنے ایک اجنبی کے ساتھ چہک چہک کر باتیں کرتے دیکھ کر حیران ہوگئی۔

اور پھر یکایک اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹرے کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اجنبی اس کی مدد کے لئے پہنچتا وہ سنبھل گئی اور اس نے ٹرے بیچ میں پڑی ہوئی میز پر رکھ دی اور اجنبی کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی ایک ناکام کوشش کی۔

"شکریہ" اس نے اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ابھی بھی کپکپاہٹ تھی۔

"ممی۔ ممی۔ انکل سے ملئے" انل نے پرجوش تعارف کراتے ہوئے کہا۔ وہ گھر میں ہر آنے والے کو انکل ہی کہتا تھا۔

"میں ——— میں اس مداخلت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا — میرا نام

فلائیٹ لفٹیننٹ سہگل ہے۔ میں اس طوفان میں گھر گیا تھا۔ آپ کے گھر بجلی جلتی دیکھکر ادھر آ گیا۔ میں نے سوچا طوفان کے رکنے تک آپ کے ہاں پناہ لے لوں۔"

"ہاں ہاں ــــ بہت خوشی سے۔ آپ کے اس طرح آجانے سے میں ذرا گھبرا گئی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب ایسا ہی ایک باوردی افسر ہمارے ہاں آیا تھا تو وہ میرے خاوند کی موت کی خبر لایا تھا۔ خیر جانے دیجئے۔ نہ جانے مجھے اس وقت اس کا خیال کیوں آ گیا۔" وہ کھڑکی کے پاس والے صوفے میں دھنس گئی۔

"اوہ! آپ کا گھبرا جانا قدرتی بات تھی۔ مجھے اس تکلیف دہ یاد کو تازہ کرنے کے لیے معاف کیجئے گا۔ مجھے آپ کے احساسات کا صحیح اندازہ ہے۔"

"خدارا آپ اپنے آپ کو اس کے لئے ذمہ دار نہ ٹھہرائیے گا۔ تشریف رکھیے نا۔" اور پھر وہ نووارد کے بھیگے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ کو ان بھیگے ہوئے کپڑوں میں ٹھنڈ لگ رہی ہو گی۔ آپ تو بالکل بھیگ گئے ہیں۔ ٹھہریئے میں آپ کے لئے کپڑے لے آؤں۔ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھئے جائے پیجیئے۔ میں ابھی آتی ہوں۔ یہ گرم جاکلبٹ انل تمہارا ہے!"

"میں آپ کو بہت تکلیف دے رہا ہوں!"

"بالکل نہیں۔ میں ابھی آئی۔" اور شیلا کمرے سے باہر نکل گئی۔

⁂ ⁂ ⁂

سہگل نے آہستہ آہستہ چائے پیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ انل ابھی تک ڈیکوٹا ہوائی جہاز کا ماڈل بنانے میں مصروف تھا۔

"تمہارے پاس تو ہوائی جہازوں کے بڑے اچھے اچھے ماڈل ہیں!" کمرے

کے کونے والی الماری میں ماڈلوں کا اچھا خاصہ مجموعہ تھا۔ سہگل احمد کی الماری کے قریب پہنچ گیا۔

"ہاں۔ میرے پاس ہری کین آرگین، ویمپائر، ہارورڈ، ڈیکوٹا، اسپٹ فائر، وائیکنگ کامٹ سب ہی ماڈل ہیں۔" اس نے ایک ماہر کی طرح تمام جہازوں کے نام گنوا دیے۔

"انل تمھارے پاس تو اچھی خاصی نمائش ہے۔ تمھیں یہ ماڈل کس نے دیے؟"

"واہ ڈیڈی نے! میرے ڈیڈی ایر فورس میں ہوائی جہاز چلانا سکھاتے تھے۔"

"اوہ تمھارے ڈیڈی فلائنگ انسٹرکٹر تھے!" اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ "کیا نام تھا تمھارے ڈیڈی کا؟"

"فلائنگ انسٹرکٹر سریش واسودیوا!"

"فلائنگ انسٹرکٹر سریش واسودیوا!" اس نے یہ الفاظ عالم خواب میں دہرائے اس کا چہرہ زرد پڑگیا۔ کمرے کی کرسیاں اور پھڑپھڑاتے پردے اس کی نگاہوں کے پردوں میں دور دھندلے ہوتے چلے گئے اور انل کا معصوم اور واضح چہرہ اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں اور پھر اس کے چہرے کے شکن رفتہ رفتہ ایک دھندلی مسکراہٹ میں تحلیل ہوگئے۔ اس نے بچے کو پیار سے گلے لگالیا۔

"تمھارے ڈیڈی تو میرے بہت قریبی دوست تھے بیٹے! ہم بہت عرصہ اکٹھے رہے ہیں!"

اتنے میں شیلا کپڑے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ "آپ دونوں تو گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں!"

"آپ کا بیٹا تو بہت ہوشیار ہے مسز ——"

"...واسو دیوا!" شیلا نے فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

سہگل نے شیلا سے کپڑے لیے۔ "بہت بہت شکریہ!"

"معاف کیجیے گا مجھے کپڑے ڈھونڈنے میں ذرا دیر ہو گئی۔" وہ ایک لمحہ کے لیے رکی

"جائیے آپ کپڑے تبدیل کر لیجیے۔ باتھ روم برآمدے میں بائیں طرف ہے۔"

"میں آپ کو بہت تکلیف دے رہا ہوں مسز واسو دیوا!" معذرت چاہتے ہوئے

کمرے سے باہر چلا گیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

"ممی انکل تو ڈیڈی کے بہت پکے دوست ہیں۔ دونوں بہت عرصے اکٹھے بھی رہے

ہیں!" انل نے شیلا کو خبر دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" اور پھر اس نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے چاکلیٹ تو

ختم نہیں کیا!"

"ابھی کرتا ہوں!"

"تو جلدی کرو نا۔ سونے کا وقت ہو رہا ہے۔" انل نے چاکلیٹ چبانا شروع کیا اور شیلا

سوئیٹر بننے بیٹھ گئی۔ سہگل بھی چند ہی منٹوں میں کپڑے بدل کر آ گیا۔

"...اچھا انل اب انکل کو گڈ نائٹ کہو اور سونے جاؤ۔"

"گڈ نائٹ ممی، گڈ نائٹ انکل" اس نے نیا رشتہ: ماڈل بڑے پیار سے میز پر

رکھتے ہوئے کہا۔

"گڈ نائٹ انل..... میں تمھارے لیے اور بھی ماڈل بھیجوں گا!"

⁂ ⁂ ⁂

نیچے کے چلے جانے کے بعد سہگل کی نگاہیں دیر تک میز پر پڑے ہوئے ڈیکوٹا کے ماڈل پر جمی رہیں جو کہ انل نے ابھی ابھی تیار کیا تھا۔ ماڈل کمرے کی روشنی میں چمک رہا تھا کمرے میں کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔

"انل کہہ رہا تھا کہ آپ میرے خاوند کو اچھی طرح جانتے تھے!" شیلا نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "میں شرمندہ ہوں کہ مجھے اپنے خاوند کے دوستوں کا بھی پتہ نہیں وہ اکثر نون فیملی اسٹیشنوں پر رہتے تھے جہاں ان کے دوستوں سے میں مل نہیں سکی۔"

"ہاں!" اور جیسے سہگل نے پھر چپ سادھ لی۔ اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد جیب میں سے سگریٹ کیس نکالا۔

"آپ کو میرے سگریٹ پینے پر اعتراض تو نہیں؟" اس نے اپنی جیب میں دیا سلائی ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں" وہ مسکرا دی "معاف کیجئے گا گھر میں سگریٹ نہیں ہیں اور اسی لئے یہاں دیا سلائی بھی نہیں کہئے تو رسوئی میں سے لے آؤں؟"

"آپ تکلیف نہ کیجئے۔ یہ رہی!" اس نے دیا سلائی نکال کر سگریٹ سلگاتے ہوئے ایک گہرا کش لیا۔

"ہوں؟" شیلا نے سہگل سے بات چیت جاری رکھنے کی توقع رکھتے ہوئے کہا۔ اسے نہ جانے یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ سہگل اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

"ہم دونوں کشمیر میں اکٹھے تھے اور بعد میں پونا میں۔ میں پونا ہی میں تھا جب یہ حادثہ ہوا۔ واقعی یہ افسوسناک ٹریجڈی تھی۔ خصوصاً میرے لئے ہر کسی کو اس کا

بے حد افسوس تھا! وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

"یقین مانیے جہاز اڑانے کے اس خطرناک پیشے میں بھی ہم میں سے ہر کوئی ہیم سری کے جذبے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اور میرے دوسرے ساتھیوں نے جنھیں آپ کے خاوند سے فلائنگ سیکھنے کا موقع ملا، اس جذبہ کی قدر کی۔ سر لشیں کہا کرتے تھے "خطرہ ہی زندگی ہے!" نہایت افسوس کی بات ہے کہ آنند کی بے پرواہی اور نالائقی کی وجہ سے ان کی جان گئی۔" اس آخری جملہ میں آنند کے خلاف سخت حقارت کا جذبہ پنہاں تھا۔

"آنند؟" شیلا نے سوئٹر بنتے بنتے دفعتاً نظریں اٹھائیں۔ اس کی آواز میں نرمی کے علاوہ ایک حد تک حیرانگی تھی۔ "یہ آنند کون ہے؟ اس کا میرے خاوند کے حادثے سے کیا تعلق ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ حادثہ انجن کی خرابی کی وجہ سے ہوا تھا۔"

"ہاں ٹوٹے ہوئے جہاز کے دریا میں گر جانے کی وجہ سے کورٹ آف انکوائری نے یہی فیصلہ دیا تھا۔" سہگل نے ایک لمحہ شیلا کی طرف دیکھا اور پھر اس نے نظریں جھکالیں۔ "لیکن مجھے معلوم ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا!"

یکایک بجلی زور سے چمکی اور پھر بادلوں کی دل دہلا دینے والی بھیانک گرج سنائی دی۔ شیلا نے سوئٹر ایک طرف رکھ دیا اور وہ بے تابی سے سارا واقعہ سننے کا انتظار کرنے لگی۔

سہگل نے غمگین آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں ہوائی اڈہ پر ہی تھا جب دونوں ہوائی جہاز ایک ساتھ اڑے تھے وہ پون گھنٹے تک معمول کی طرح مختلف مشقیں کرتے رہے آخری مشق میں دونوں ایک ساتھ اڑتے ہوئے جہازوں کو مختلف سمتوں میں

چلا جاتا تھا لیکن عین اس وقت آنند کا جہاز سریش کے جہاز کے بالکل قریب آگیا اور اس کا پورٹ ونگ سریش کے جہاز سے ٹکرا گیا۔ سریش کے جہاز کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا اور جہاز کو آگ لگ گئی ـــــ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ختم ہو گیا۔"

شیلا اس کی باتوں میں بالکل کھو گئی تھی۔

سہگل کہہ رہا تھا۔ "یہ سارا حادثہ وقت کے غلط اندازے کی وجہ سے ہوا۔ آنند کے جہاز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ واپس ہوائی اڈہ پر پہنچ گیا۔ خدا کی قسم آنند کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس بے چارے کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ زمین پر تھا یا آسمان پر۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو سریش کی موت کا ذمہ دار تصور کرتا تھا۔۔۔"

سہگل کی انگلیوں میں پکڑا ہوا سگریٹ جل چکا تھا "بے چارہ!" اس نے سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا چائے کی طشتری میں مسل کر بجھاتے ہوئے کہا۔ "بے چارے آنند میں ہمت نہ تھی کہ وہ کورٹ آف انکوائری کو صحیح حالات سے آگاہ کرتا۔ میرے خیال میں آنند سے زیادہ سریش کی موت کا افسوس کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کئی مرتبہ وہ اپنے آپ سے قطعاً مایوس ہو گیا۔ شاید نوبت خودکشی تک بھی پہنچ جاتی لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا آنند کے مرنے سے سریش واپس تھوڑا ہی آسکتا تھا پھر آنند خود شادی شدہ تھا اس کے دو بچے تھے۔"

"میرے خیال میں خودکشی سے زیادہ غلط قدم اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا!" شیلا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "آخر اس نے جان بوجھ کر تھوڑا ہی ان کے جہاز کو نقصان پہنچایا تھا یہ تو محض حادثہ تھا۔"

"میرے نزدیک اس کے اس قصور کو معاف کر دینا آپ کی بلند خیالی اور عظمت ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسا کر سکتے ہیں" سہگل شیلا کی باتوں سے بے حد متاثر نظر آتا تھا۔

"جب میں اگلی بار آنند سے ملوں گا تو میں آپ سے ملاقات کا ذکر ضرور کروں گا اور کہوں گا کہ آپ نے اسے معاف کر دیا ہے ——— آپ واقعی عورت کے ایثار اور عظمت کی ایک بہت نادر مثال ہیں!" سہگل نے شیلا کی طرف عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ گویا وہ کوئی مجسم دیوی ہو۔

باہر بارش تھم چکی تھی۔ طوفان ختم ہو چکا تھا ایک لمبی خاموشی کے بعد شیلا نے آہستہ سے کہا۔

"دیر ہو رہی ہے۔ آپ آرام کرنا چاہیں گے؟"

"ہاں مجھے صبح جلد ہی جانا ہے!"

"آپ کس وقت جائیں گے ———؟" شیلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بہت صبح ہی جانا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے آپ کو پہلے ہی بہت تکلیف دی ہے" اور پھر اس نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔

"گڈ نائٹ مسز واسودیوا۔ خدا آپ کو اور انل کو ہمیشہ خوش رکھے۔ انل بہت ہی ہوشیار لڑکا ہے"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اگلے روز صبح جب شیلا اٹھ کر ملاقاتی کمرے میں آئی تو سہگل جا چکا تھا۔ شیلا کے دیئے ہوئے کپڑے نہایت قرینے سے صوفے پر رکھے تھے اس کے قریب

ہی وری پر ڈائری پڑی تھی جو شاید سہگل کی جیب سے اتفاق سے گر گئی تھی۔ بتیلا نے اسے اٹھالیا اس میں سے چند کاغذات بکھر گئے۔

ان میں کچھ پرانے بل اور کیش میمو تھے۔ اس کے علاوہ اس مہینے کے شروع میں مسز داسوديوا کے حساب میں فلائیٹ لفٹیننٹ آنند سہگل کی سو روپے جمع کروانے کی رسید بھی تھی!

کانٹا

سیّد احتشام حسین کے نام

منگو زور زور سے اپنے سینے کو ملنے لگا جیسے وہ اپنے جسم کے اندر کی چبھتی ہوئی نوکیلی چیز کو مسل کر رکھ دے گا۔

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ اس کے ڈگمگائے پاؤں بیخودی کے عالم میں ہر سیڑھی کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سیڑھیاں نہایت تنگ و پرانی تھیں، جگہ جگہ سے پتھر اکھڑ گئے تھے اور وہ نہایت احتیاط سے اتر رہا تھا۔ سیڑھیوں میں کافی اندھیرا تھا اور اس کے ہاتھ اترتے وقت زینہ کی بوسیدہ دیوار کا سہارا لے رہا تھا جس کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اتر گیا تھا اور جو ابھی تک نیم خشک پان کی پیک کی وجہ سے نمدار تھی سامنے کے کوٹھے سے کوئی رقاصہ اپنے گھنگرو کی جھنکار سے سامعین سے داد حاصل کر رہی تھی وہ دل ہی دل میں سازندوں کے جھکے سر اور طبلچی کی تھرکتی ہوئی گردن کا خیال کر رہا

تھا۔ یکا یک نیچے دروازے کے قریب کچھ لوگوں کے بیہودہ قہقہے گونجے۔ انھوں
نے بہت شراب پی رکھی تھی اور وہ بدمستی کی حالت میں جھومتے جھامتے زینے پر
چڑھ رہے تھے۔ منگو کو اپنے قدموں کی بے ہنگم آہٹ ان کے فراخ قہقہوں میں
گم ہوتی معلوم دی۔

"واہ بانو واہ! جیو! کیا جادو ہے تیری اداؤں میں۔" شاید وہ سامنے کے کوٹھے
سے ناچ دیکھ کر آرہے تھے۔

"بھئی واہ کیا بات ہے بانو کی۔ گلے میں کوئی باندھ رکھی ہے کوئل!" دوسرے
نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

یکا یک کسی کا نرم نرم بھاری سا جسم منگو سے ٹکرایا۔ منگو کا جسم ایک دم اکڑ گیا
اور اس نے اس زور سے پرے ڈھکیل دیا کہ وہ گرتے گرتے سنبھلا۔

"اوے۔ اندھا ہے کیا؟" منگو نے غصہ سے گلابی ہندوستانی بولتے
ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔ اجی حضرت آنکھیں تو آپ کی پھوٹ گئی ہیں!" دوسرے نے
شراب کے نشے میں ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اوے منھ سنبھال کے گل کرا کو مکہ مارانگا ساری شیخی ڈھلی پے جائیگی۔"
منگو نے خالص لاہور کی پنجابی میں کہا۔ اس نے آستینیں چڑھالیں اس کی کرخت
اور ضرورت سے زیادہ بلند آواز زینے میں گونج اٹھی۔

"باپ رے۔" اور وہ دونوں لپک کر لڑکھڑاتے ہوئے اوپر
چڑھنے لگے۔ منگو جلدی سے نیچے اتر گیا جب وہ دروازے کے قریب پہونچا

تو اسے زینہ کے اوپر ہانپتے ہوئے شرابیوں میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔ "خدا غارت کرے ان شرنارتھیوں کو! انھوں نے تو جینا دوبھر کر دیا ہے!"

یکا یک منگو رک گیا۔ "کی کہیا اوے! پھیر تہاڈی..." وہ تیزی سے مڑا اور اس نے پنجابی میں ایک غلیظ سی گالی بک دی۔

"او باپ رے!" اور وہ دونوں جلدی سے امراؤ جان کے کوٹھے میں گھس گئے۔

شرنارتھی! اور جیسے اس کا اکڑا ہوا جسم فوراً ڈھیلا پڑ گیا اس کی کنپٹی جلنے لگی اسے اس نام سے کتنی چڑ تھی۔ کوئی چیز تیزی کے ساتھ اس کے سینے میں اتری چلی جارہی تھی۔ اور وہ زور زور سے منہ کو ملنے لگا جیسے اس کے دل کی خلش سکوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ ایکا ایک اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بھولا بھالا معصوم چہرہ پھیل گیا۔ نہایت خوبصورت گول تراشا ہوا لیکن جس کی پیشانی پر کبھی نہ مٹنے والے فحش الفاظ چپک رہے تھے اور وہ فریاد کرتی ہوئی خاموش نگاہیں جو اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے، اس کا جی متلانے لگا پھر وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔

وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا حتیٰ کہ بازار میں سے کسی کے قہقہوں نے اسے چونکا دیا اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ مفلر کو دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر کمر کا سہارا دیتا باہر گلی میں آگیا۔ یہ اس کے چلنے کا خاص انداز تھا یکدم اندھیرے سے روشنی میں آجانے کے باعث اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بجلی کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ نہایت افسردہ نظر آرہا تھا جیسے اس کا دماغ کوئی گتھی سلجھا رہا ہو۔ رات

کافی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سارے بازار میں صرف دو ایک جگہ سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیشتر دریچے خالی پڑے تھے ۔۔۔ سنسان نشستیں بڑے بڑے گاؤ تکیے، پھولوں کے ہار، رنگین کاغذوں کی خوبصورت جھالریں، آنکھوں کو چندھیا دینے والے قمقمے۔ اس سے پرے کمروں کے دروازے بند تھے اور ان کے ہاں رنگین شیشوں میں سے سرخ سبز روشنیاں چھن کر آرہی تھیں۔ بعض کمروں میں تو بالکل اندھیرا تھا صرف کہیں کہیں اب بھی کوئی سیاہ فام صورت منڈیر کے ساتھ جھپٹے بازار میں جھانک رہی تھی۔ اور وہ کونے والی شہناز تو گاہک کے انتظار میں اونگھتے اونگھتے منڈیر کے ساتھ سر ٹکا کر سو گئی تھی۔ کتنی موٹی اور ڈراونی تھی اس کی شکل! اس کھوسٹ بڑھیا کے ہاں اب کون جائے گا؟ بازار میں اب بھی چند ایک تماشائی گھوم رہے تھے اور وہ موٹا لمبا تڑنگا موٹر کمپنی کا منیجر شراب کے نشے میں وحشت جھومتا جھامتا گلنار کے کوٹھے کی طرف جا رہا تھا۔ اسے اس ماحول سے یکدم نفرت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مظلوم توشی کا چہرہ نہایت تیزی سے گھومنے لگا، بے بس لاچار جیسے وہ اس سے بھیک مانگ رہی تھا۔ یکایک اس کا جسم تن گیا، مٹھیاں بھنچ گئیں، آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بازار میں پھرتے ہوئے لوگوں کو مار بھگائے۔

شرنارتھی؟ معاً اس کے دماغ میں خیال آیا۔ یقیناً وہ رحم کا مستحق نہ تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ چپ چاپ دھیرے دھیرے چل دیا۔

وہ چلتے چلتے پنواڑی کی دکان پر رک گیا۔ دکان پر لگے ہوئے آئینہ نے اُس کی صورت میں شکن ڈال دیے۔ وہ قریب آیا اب اس کا چہرہ کچھ صاف طور پر

دکھلائی دے رہا تھا۔ اس نے قمیص کا کالر ٹھیک کیا۔ مفلر کو گلے کے گرد لپیٹا۔ اپنے سر کی کالی ٹوپی کو درست انداز سے رکھا اور اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو سہلانے لگا۔ اب یہ گھنی مونچھیں اس کے دبلے چہرے پر نہایت بھونڈی معلوم ہو رہی تھیں۔ کتنا دبلا ہو گیا تھا وہ! گال اندر دھنس گئے تھے اور اس کے چہرے کی ہڈیاں صاف طور پر دکھلائی دے رہی تھیں اور چہرے کا رنگ کس قدر پیلا پڑ گیا تھا۔ آج سے صرف ایک ڈیڑھ سال پہلے وہ کس قدر ہٹا کٹا نوجوان تھا۔ اب تو اس کا جسم گھل گیا تھا۔ منگو پہلوان! ایک تلخ ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھڑپھڑانے لگی۔ یکایک کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کہیئے کیا چاہیئے پان؟ بیڑی، سگریٹ؟" پنواڑی پوچھ رہا تھا۔

"دو پان اور سگریٹ" اس نے بے خودی کے عالم میں جواب دیا۔

"کونسا، قینچی۔ برکلے، کیپسٹن؟"

"کوئی سا بھی۔ میرے پاس صرف چھ پیسے ہیں" پنواڑی پان لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ایک جماہی لی اور سر پر رکھی ہوئی کالی ڈکدار ٹوپی کو آگے کی طرف جھکا دیا۔ اس کی نگاہیں اٹھتے ہوئے بازو پر جم گئیں جہاں زخم بھرنے کی وجہ سے جلد سکڑ کر رہ گئی تھی۔ لاہور سے بھاگتے وقت اس کے دوستوں کی یادگار! دوست؟ اور اس نے نالی میں تھوک دیا۔

لاہور .... منگو پہلوان .... کتنا ادب کرتے تھے تب اس کے ساتھی اور کس قدر طاقت ور تھا وہ۔ سارے کوچے اور بھاٹی میں اس کی دھاک جمی ہوئی تھی اس نے باہیں اونچی کیں اور بازو کی مچھلیوں کو محسوس کرنے لگا اب تو اس کا جسم جھڑ گیا تھا! روزانہ پانچ سات سیر دودھ اور پاؤ ڈیڑھ پاؤ گھی ہضم کرنے والا جسم

فاقوں اور کم غذا ملنے کے باعث محض ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ رحمان اور راجو کو بھی جو اپنے آپ کو بڑے پہلوان کہلوایا کرتے آخر اس کا لوہا ماننا پڑا۔ یہ الگ بات تھی کہ اسے روٹی کمانے کے لئے کچھ عجیب سا وسیلہ ہی اختیار کرنا پڑتا۔ مثال کے طور پر سینما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکٹنگ، پیسے لے کر کسی کی مرمت وغیرہ وغیرہ جو ہر نیک آدمی سب کے سامنے نہیں کر سکتا لیکن پہلوانی آخر سوکھے دال بھات پر تھوڑی ہی قائم رہ سکتی ہے!

اور کتنا بڑا تھا اس کا گروہ۔ نفیر محمد جو جیب کاٹنے میں ہوشیار تھا، شیخ علی چلتا پرزہ جو ہر قسم کے تالے تجوریاں توڑنے میں ماہر تھا اور چودھری رامو جس کے دماغ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ جنم لیتا رہتا۔ اور پھر وہ ملٹری سے ڈسچارج شدہ شوکت، سنتا!! ان میں سے ہر کوئی طوفان مچا سکتا تھا۔ سینما گھروں کے مینیجر، شراب کے ٹھیکیدار اور ہیرا منڈی کے دلال ان سب کا خاص خیال رکھتے۔ ان میں سے کسی نے بھی جنم بھر سے لے کر ایک کوڑی تک نہ خرچی تھی اور اچھی سی اچھی چیزیں ان کے قدموں پر لوٹتیں سینما جائے تو باکس میں پورے کا پورا گروہ۔ ہیرا منڈی جائے تو اچھے سے اچھا مال ان کی نذر ہوتا اور شراب کے ٹھیکیدار کے ہاں کبھی دھاوا ہوتا تو بڑھیا سے بڑھیا دیسی ٹھرا!

اور پھر وہ اپنے کرمفرماؤں کے لئے کتنے کار آمد بھی تو ثابت ہوتے۔ بھاٹی اور ہیرا منڈی کے سینما گھروں میں ردی سے ردی کھیل پر اتنا رش کروا دیتا کہ کھڑکیاں ٹوٹنے پر نوبت آجائے اور اچھی سے اچھی فلم پر ہال بالکل سنسان کرا دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور پھر وہ اسی روز روشن ٹھیکیدار کے ہاں نہ ہوتے تو بے چارا کبھی کا جیل میں پہنچ گیا ہوتا۔ شراب خانے کے عقب میں جوا چل رہا تھا۔ فضا میں بوتل کی مہک تھی۔ ایک دم پتہ چلا کہ پولیس چھاپہ مار رہی ہے۔ روشن کے تو ہاتھ پاؤں

ہی پھول گئے۔ سب لوگوں کے چہرے زرد تھے۔ لیکن منگو نے سب کو دلاسا دیا۔ اس نے
تمام چیزیں اس پھرتی سے غائب کیں کہ بعد میں چپہ چپہ تلاشی لینے پر بھی کچھ دستیاب
نہ ہو سکا۔ لیکن یہ سب ایک سال میں خواب کی طرح دھندلی لکیریں بن کر
رہ گئیں۔

"لیجئے پان" وہ چونک پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو پنواڑی اسے پان دے
رہا تھا۔ اس نے پان لے لئے جیب سے پیسے نکال کر تھالی میں ڈال دیئے۔ سکے
کھنکھنائے اور پنواڑی نے اس کے ہاتھوں میں پاسنگ شو کا ایک سگرٹ تھما دیا اس
نے پان منھ میں ڈالے۔ سگرٹ سلگایا اور مفلر کو گردن کے گرد ڈالے دونوں سروں
کو اپنے دونوں ہاتھوں سے نیچے کی طرف کھینچتا آگے بڑھ گیا۔

"کتنے بدذائقہ تھے یہ پان!" اس نے پیک تھوکتے ہوئے سوچا۔ یو۔ پی میں تو
کسی کو پان لگانا بھی نہیں آتا اور اسے لاہور کے کھتو کے پان یاد آ گئے۔ کتنے خوشبودار
میٹھے اور ذائقہ دار تھے وہ! وہ فقیرا اور منڈا جب کبھی میکلوڈ کی طرف نکلتے تو
وہ کھتو کے یہاں ضرور پان کھاتے اور پھر منڈے کا خیال آتے ہی اس کے دائیں
بازو میں درد ہونے لگا۔ کمبخت نے کتنی بری جگہ پہ گولی ماری تھی اسے رہ رہ کر
شوکت پہ غصہ آ رہا تھا۔ وہی شوکت جس کو اس نے آسمان پہ چڑھایا اور اس
نمک حرام نے اس کا یہ عوض دیا۔ اسے شرنارتھی بنا دیا!

شرنارتھی؟ اسے ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی کانٹے جیسی نوکیلی چیز اس کے
جسم کی تہوں کو پار کرتی اندر گھستی چلی جا رہی ہو کیا وہ واقعی شرنارتھی کہلائے جانے
کا مستحق تھا؟ اس کا ضمیر بغاوت کر رہا تھا۔ وہ شرنارتھی! وہ جس کا کروڑوں لاکھوں

کو بے گھر کرنے میں ہاتھ تھا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ دور خالی فضا میں اسے نیلے نیلے نقط اس کا منہ چڑاتے نظر آئے گویا وہ اس کی ذلت کا انتقام لے رہے ہوں۔ اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہوگیا ایکا ایک اس نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا بجلی کی روشنی میں اس کے ہاتھ پر بیل بوٹوں کے درمیان کھدا نیلا سا نام چمکا اس نے فوراً جیب سے رومال نکال کر کھدے ہوئے نام پر باندھ دیا۔ وہ اسے دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ لاہور سے ذلیل ہو کر نکلا تھا تو یہی کھدا ہوا نام لاہور اور ہندوستان کی سرحد کے درمیان ایک بلند فصیل کی طرح کھڑا تھا۔ لیکن اس نے اس کھدے ہوئے نام پر پٹی باندھ دی اور اس پر کچھ خون چھڑک دیا تاکہ وہ اس رکاوٹ کو پار کر سکے۔ خون! ہاں انسانی خون اور اس کے دماغ میں جیسے لاوا سا ابلنے لگا۔ وہ ہندوستان کی سرحد میں آگیا۔ بھارت ماں کی گود میں جو اپنے آنچل میں امن وسکون چھپائے بیٹھی تھی ـــــ اور وہ شرنارتھی بن گیا۔ شرنارتھی! ریفیوجی کیمپ، کم غذا، بیماری، چلچلاتی دھوپ، کڑکتا جاڑا، لاغر جسم اور کرم خوردہ دماغ!

سڑک بالکل سنسان تھی اور بجلی کے قمقمے جیسے اسے تاک رہے تھے۔ اس کا ذہن پھر پرانی یادیں کریدنے لگا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ منگت رام شرنارتھی ولد بھگت رام ذات بھُسری قوم ہندو سکنہ لاہور پاکستان نہ تھا بلکہ منگو پہلوان تھا جس کے اشارے پر لاہور کے شمال مغربی حصہ میں انوکھے سے انوکھا واقعہ ظہور پذیر ہو سکتا تھا جس کی ہلکی سی جنبشوں پر سنیما گھر کے مینیجر، شراب کے ٹھیکیدار اور ہیرا منڈی کے دلال ناچتے تھے۔

ایک روز وہ شیخ فقیرا اور راموپیو کر کھیل رہے تھے۔ شیخ کہیں سے جانی واکر کی بوتل مار لایا تھا۔ ان دنوں ملک کا بٹوارہ ہونے والا تھا اور یہ افواہ گرم تھی کہ لاہور ہندوستان میں چلا جائے گا۔

"لاہور ہندوستان میں جائے یا پاکستان میں! ارے ہمیں تو اپنی گانٹھ سے مطلب ہے۔" فقیرا پیالے پر پیالہ چڑھائے جا رہا تھا۔

"ارے ہماری بلا سے جائے جہنم میں" شیخ نے نشے میں اس کی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ارے بس یہ ہونا چاہئیے" اور اس نے جیب سے چاندی کا روپیہ نکال کر ہوا میں اچھالا۔ روپیہ چھن کر کے کھنکھنایا اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

"ارے اوکل نندو موٹا ملا تھا۔ کمبخت عیش کرتا ہے اب بیٹرو اور اسٹینڈرڈ میں!" یکایک راموں نے چونک کر کہا۔

"ارے او نندو۔ اب نندو موٹا اسٹینڈرڈ میں!" منگو بے اختیار ہنس پڑا۔

"ارے پہلوان سچ۔ لنگڑے پیر کی قسم۔ سالا گھومتا پھرتا ہے موٹر میں۔ اب تو اس کے پاؤں نہیں ٹکتے۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا!" فقیرا بول اٹھا۔

"بھا کیا کہہ رہے ہو ارے وہ پچیس بار بھی جنم لے تو اسٹینڈرڈ اور بیٹرو میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ نندو اور اسٹینڈرڈ!" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"پہلوان کیا پوچھتے ہو کمبخت نے راولپنڈی میں وہ رقم کاٹی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں۔ ارے بھائی جب خدا دیتا ہے بس نہال کر دیتا ہے۔"

"ارے کب ان جھگڑوں میں؟" منگو نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"تو اور کیا۔ اللہ میاں آسمان میں چھید کر کے دینے سے تو رہے۔ بس پہلوان تم یونہی کچھ کرو گے بھی یا نہیں۔ ارے بھائی یہی موقع ہے اپنے ہنر دکھانے کا"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"ارے وہ گنیشی ہے نا۔ سیٹھ گنیش داس۔ حرامی نے ہم سب کو بہت تنگ کیا تھا پچھلی بار لگاؤ اس کو ٹھکانے"

"اور اس کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں سونے کی! سب قبر میں لے جائے گا کیا؟"

اور سب کچھ وہیں طے پا گیا۔ اگلے روز گنیش داس کے مکان کو آدھی رات میں آگ لگا دی گئی۔ منڈا اشوکت تو فوج سے چھٹ کر آیا تھا۔ اسی لئے وہ تمام گر تیج جانتا تھا۔ مکان پر پٹرول چھڑک دیا گیا اور اس چالاکی سے کہ تجوری تک پہنچنے کا راستہ بالکل بیدھا رہے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ اور رامو کی چال کس قدر کامیاب رہی جونہی آگ لگی۔ رامو نے چلانا شروع "مسلمانوں نے مکان میں آگ لگا دی" اور اس کے ساتھ ہی ہوا میں جھوٹ موٹ کے فائر کر دیئے سب لوگ ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ کچھ لوگ اسلحہ لے آئے اور انھوں نے قریب ہی مسلمانوں کے مکان میں آگ لگا دی۔ جب تک منگو کا گروہ لالہ جی کی پونجی لے کر بہت عرصہ سے نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں میں زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اور اصلی فساد کرانے والے وہاں سے غائب تھے جس میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اس کے بعد پے در پے کئی رئیسوں کو لوٹا گیا جب کبھی مسلمان رئیس کا مکان ہوتا تو فقیرا چلا دیتا۔ "ہندوؤں نے آگ لگا دی" اور جب کسی ہندو کا گھر ہوتا تو رامو پکار اٹھتا "یہ شرارت مسلمانوں کی ہے" سب نے گن گن کر پرانے حساب چکائے بس پھر کیا تھا منگو کے گروہ کی کامیابی دیکھ کر شہر کے دوسرے

غنڈے بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر یہ طوفان منگو کے بس کا نہ رہا وہ اپنے ہاتھوں
لگائی ہوئی آگ میں خود جھلس گیا۔ شیخ فقیرا اور مسٹنڈہ جو چند ہی مہینے پہلے اس کی
محبت اور رفاقت کا دم بھرتے تھے اس کے خلاف ہو گئے۔ منگو کو کبھی اس کا
گمان بھی نہ تھا اور ایک دن خود اسے جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا لیکن کمبختوں
نے جاتے ہوئے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بیچارا رامو جو منگو کے ساتھ تھا اپنے
ساتھیوں کی ہی گولی کا نشانہ بن گیا اور وہ خود زخمی ہو کر لاہور سے چلتی گاڑی پر
چڑھ گیا۔ بدمعاشوں نے اسے ایک کوڑی تک بھی نہ دی اور اسے یہ دن دیکھنے
پڑے۔ امرتسر پہنچتے پہنچتے ہی منگو پہلوان منگت لام شرنارتھی رجسٹریشن کارڈ
نمبر ۵۰۱ ہو گیا۔

اب جب اس نے میلوں لمبے قافلوں کو بھوک پیاس سے بلبلاتے دیکھا اور
عورتوں کی آہ وزاری سنی زخمیوں اور بیماروں کی حالت دیکھی تو اسے یہ احساس
ہوا جیسے وہ اتنے بے قصور لوگوں کو گھروں سے نکالنے کے لئے ذمہ دار تھا
اس کا ضمیر اسے مجرم ٹھہراتا اور وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا وہ جانتا تھا کہ یہ
قصور صرف چند لوگوں کا تھا جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑ رہا تھا لیکن اب
یہ سب کچھ بے سود تھا۔ پانی سر سے اوپر گزر چکا تھا اسی لئے جب کبھی کوئی شرنارتھی
کہتا تو اس کا سر شرم کے مارے جھک جاتا۔

اور آج تو جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ
آج شام سے ہی بہت بیقرار تھا جیسے وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہو۔ اس نے
دن بھر سودا بیچنے کے بعد اندھیرا پڑتے ہی چوک کا رخ کیا۔ سوچتے کے خوشنما

ہار خریدے اور امراؤ جان کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ وہ مدت سے امراؤ جان کو جانتا تھا۔ اس کے ہاں ہمیشہ مال تازہ اور عمدہ ہوتا۔ گو وہ لاہور والی بات تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس کے ہاں لاہور سے ملتا جلتا رنگ تھا۔ اس نے اچھی طرح نگاہ دوڑائی اور پھر پانچ روپے کا نوٹ امراؤ جان کے حوالے کیا اور نسیم کو اپنے ساتھ لے کر کمرے کی طرف چل دیا۔

وہ اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ نسیم کے ساتھ جا چکا تھا۔ وہ بیحد ناز نخرے والی تھی اور اس کی ایک ایک ادا بجلیاں گراتی۔ اب وہ کمرے میں پہنچتے ہی وہی نخرے کرنے لگی۔

"دیکھو میری جان تم کتنی دیر بعد آتے ہو میرے سر کی قسم جلدی آیا کرو نا۔"
وہ اس کی لمبی لمبی مونچھیں سہلانے لگی۔

"اس دفعہ کچھ دیر ہو ہی گئی ـــــ" اس نے باہیں جھلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ڈیر" نسیم وقت پڑنے پر انگریزی کے دو چار لفظ بول لیا کرتی تھی جو شاید جنگ کے دوران اس نے گوروں سے سیکھے تھے۔ "اب پہلے کھلاؤ پلاؤ نا ـــــ یہ کھوسٹ بڑھیا تو کچھ کھانے پینے کو دیتی ہی نہیں۔ کچھ بیئر منگواؤ اور ہاں پیر بخش کے گرم گرم کباب تو نہایت عمدہ ہیں۔" منگوان تمام ہتھکنڈوں کو جانتا تھا لیکن یہ جانتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ سارے بازار میں اسے نسیم پسند تھی اور پھر یہ تھا بھی سستا سودا مانا کہ پانچ روپے کی بجائے اسے آٹھ نو خرچ کرنے پڑتے لیکن وہ پندرہ روپے میں بھی سستی تھی۔

"اچھا جانی اگر بھوک زیادہ لگ رہی ہو تو منگوا لو۔" نعیم کا چہرہ کھل گیا۔

"تم کتنے اچھے ہو منگو" اس نے لپک کر اس کے گال چوم لیے اور پھر وہ اونچی آواز میں بلانے لگی۔ "تو شی۔ اری تو شی!"

اتنے میں دروازہ کھلا۔ ایک بوٹے قد کی خوبصورت سی لڑکی داخل ہوئی اس کی عمر مشکل سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی اور اس کی پیشانی پر پٹی سی بندھی ہوئی تھی۔ پٹی کے باعث اس کا چہرہ تنگ نظر آرہا تھا۔ یوں وہ کچھ زیادہ بری نہ تھی۔ منگو اسے دیکھ کر حیران سا رہ گیا اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہ بھی یہیں تھی تو وہ شائد آج کی رات کے لیے اسے ہی منتخب کرتا۔ لیکن یہ پٹی۔۔

......

"جاؤ تو شی۔ ذرا نیچے سے دو بیئر کی بوتلیں اور کباب تو لے آنا۔ منگو ڈارلنگ اسے پیسے تو دیدینا۔" اس نے نہایت پیار سے اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔ منگو نے تین روپئے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے وہ بدستور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک اچھے گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

"کیا ہوا تمھاری پیشانی کو؟ کیوں کچھ چوٹ آگئی؟" وہ اپنے بازو کو دیکھنے لگا جہاں زخم بھر جانے سے ایک گڑھا سا بن گیا تھا اور جیسے اسے خود درد محسوس ہو رہا ہو۔

"نہیں تو۔ بس یونہی کچھ سر درد ہو رہا ہے۔" اس نے اپنی سرپٹی

آواز میں نہایت سنجیدگی سے کہا۔ منگو کو وہ ماحول کے اعتبار سے نہایت سنجیدہ نظر آئی۔ وہ یہ کہکر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آؤ ڈارلنگ، ادھر دروازے کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" نسیم نے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکی پہلے تو یہاں نہ تھی۔"

"نہیں تو۔ بیچاری ابھی چند روز ہوئے پاکستان سے یہاں آئی ہے گھر والوں نے بھی واپس لینے سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں؟" اور منگو کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے منھ پر زناٹے کا تھپیڑ مار دیا ہو۔

"تم نے اس کے ماتھے پر نہیں دیکھا؟"

"پٹی ۔۔ ؟"

"نہیں پاکستانی نشان۔"

"لیکن ۔۔ لیکن یہ پٹی تو اس نے سر درد کی وجہ سے باندھ رکھی ہے۔"

"بے چاری اور کچھ بھی کیا سکتی ہے ۔۔ آؤ میری جان" اور نسیم نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں لیکن منگو خاموش بیٹھا رہا۔

"اجی چھوڑو بھی کس سوچ میں پڑ گئے؟ اسے تو بڑھیا کے گاہک بھی پسند نہیں کرتے۔ ان بدنما نشانات کے ہوتے ہوئے کون پسند کرے گا اسے؟ اس روز وہ ایک شخص کے ساتھ گئی۔ وہ ہی منٹ میں نکل آیا وہ گھبرا کر! اجی میری طرف دیکھو۔" اس نے گدگداتے ہوئے کہا۔ منگو بیٹھا

خالی فضا میں گھور رہا تھا۔

"یہ دیکھا کتنے لمبے بال ہیں میرے!" اس نے اپنا سر اس کی گود میں ڈھلکا دیا منگو بے دلی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا لیکن اس کی نظریں جیسے دیوار کی سفیدی میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

اتنے میں دروازہ پھر کھلا اور تو شی بیر اور کباب لے کر واپس آئی۔ اس نے تمام چیزیں تپائی پر رکھ دیں اور وہ جانے لگی۔ نسیم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آؤ میری جان لو تم بھی لو۔" اس نے اپنا ہاتھ تپائی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"توشی" منگو نے یکایک پکارا۔ وہ رک گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے حد افسردہ تھیں وہ لوٹ آئی۔

"بیٹھو" وہ چارپائی کے قریب دری پر بیٹھ گئی۔ "تم ابھی تک پاکستان میں تھیں؟"

"ہاں" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ اس کی بادامی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"تمھارے بال کس قدر خوبصورت ہیں!" اس نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ یکایک اس نے جھپٹ کر اس کی پیشانی کی پٹی کھول دی۔

وہ ایکدم گھبرا کر اس کی طرف مڑی۔ اس کی پیشانی پر چند بے ہودہ الفاظ کھدے ہوئے تھے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ غصہ سے تڑپ کر بولی "تم سب مرد ایک جیسے ہو۔ وحشی جنگلی کمینے۔ تم سب میرا مذاق کیوں اڑانا چاہتے ہو!"

اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

منگو نے اپنے ہاتھ پر کھدے ہوئے نام کی طرف دیکھا جسے وہ لاہور سے بھاگنے پر چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اس کی پیشانی پر ڈالی اور پھر وہ لیکایک اٹھ کھڑا ہوا —— کسی غیر اختیاری جذبے کے ماتحت!

نسیم کی آواز تو سسکیوں کو ڈبوتی اس کے پیچھے لپکی۔ لیکن وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی نوکیلی چیز اس کے سینے میں زور سے کھٹک رہی تھی۔ وہ سینے کو زور زور سے ملنے لگا جیسے وہ اس چبھتی ہوئی چیز کو مسل کر دکھ دیگا۔

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ اس کے ڈگمگاتے پاؤں بے خودی کے عالم میں ہر سیڑھی کو ٹٹولتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

⁂ ⁂ ⁂

آخر اس معصوم لڑکی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ جوان تھی اور وہ غنڈوں کی ہوس کا شکار بن سکتی تھی۔ لیکن پھر اس طرح سے پیشانی پر فحش عبارت ..... او خدا۔ اس کا خون ابلنے لگا۔ یہ وحشی پن کی انتہا تھی سراسر ظلم اور درندگی۔ انسانیت مر چکی تھی، صرف شیطان زندہ تھا —— قہقہے لگاتا ہوا اور اس کا منھ چڑاتا ہوا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گیئں۔ اس کے مردہ پٹھوں میں طاقت عود کر آئی اور آنکھوں سے انگارے برسنے لگے اسے ان والدین پر غصہ آ رہا تھا جنھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ پاکستانی غنڈے کمبخت! لیکن کیا مشرقی پنجاب کے غنڈے شریف تھے؟ کیا انھوں نے کچھ کم

کیا تھا؟ کیا یہی آزادی تھی؟ اور اس نے تھوک دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے نیلے حروف ناچنے لگے۔ اس کے سینے کی خلش بڑھنے لگی۔ اور وہ سینے کو زور زور سے ملنے لگا۔

یکایک وہ واپس مڑا اور نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔ وہ پان والے کی دکان سے ہوتا امراؤ جان کے کوٹھے والے بوسیدہ زینے پر چڑھ گیا اندھیری سیڑھیوں میں اس کا جسم کسی نرم نرم بھاری جسم سے ٹکرایا۔ وہ شرابی لڑکھڑاتے نیچے آرہے تھے۔

"ابے یہ کمبخت کون ہے۔" اسے ابھی تک ہچکیاں آرہی تھیں۔

"او تہاڈی ......" اور اس نے پھر پنجابی میں ایک گالی دی۔

"باپ رے۔ ارے یہ وہی شرنارتھی ہے۔" دوسرا شرابی بول اٹھا اور وہ دونوں جلد جلد زینہ سے اتر گئے۔

منگو سیڑھیوں کو پھاندتا اوپر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ توشی زینہ کی طرف شاید پھر کسی کے لئے گوشت، شراب لینے نیچے جارہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔

"توشی۔ توشی" وہ چلایا "کیا تم میرے ساتھ شادی کروگی؟ بولو توشی!"

وہ یوں ایکدم پکڑے جانے کی وجہ سے حیران ہوگئی۔ "چھوڑو مجھے جانے دو" اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"بولو توشی۔ میں تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ بولو میں جواب چاہتا ہوں۔ میں مذاق نہیں کررہا، مجھے جواب چاہیئے توشی تمھارے بنا میری زندگی نامکمل ہے۔"

توشی چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔ "کیا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں توشی ہاں۔ بولو" توشی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

منگو نے توشی کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے سینے کی خلش بالکل ختم ہو گئی ہو۔

اُلجھنیں

سجّاد ظہیر کے نام

میرے ذہن میں ایک عجب کھلبلی مچی رہتی ہے۔ دماغ ایک عجب ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے۔ احساسات کی تند لہریں سمندری موجوں کی سی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے پر اُمڈی چلی آتی ہیں۔ دماغ میں گویا ابلتا لاوا ڈال دیا گیا ہو۔ خیالات نہایت سرعت کے ساتھ ذہن میں الجھ الجھ کر ایک نہایت مہین و مضبوط جالا بننے میں لگے رہتے ہیں۔ دماغی خلا میں گویا دھواں سا بھر گیا ہو اور آس پاس کی تمام چیزوں پر جیسے ایک جھلی سی قائم ہو گئی ہو معمولی معمولی باتوں میں میری قوت ارادی کام نہیں دیتی۔ میں احساسات کی لہروں میں بہا چلا جاتا ہوں۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے سوچنے سمجھنے والا دماغ میرا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔۔ تم پوچھنا چاہتی ہو میری پریشانیوں کی وجہ کیا ہے؟ میں خود نہیں بتا سکتا!

رات کس قدر خاموش ہے! ہوا میں ایک خنکی ہے اور رات کی رانی کی خوشبو دور دور تک فضا میں تیر رہی ہے۔ میں لحاف میں لیٹا کھلی کھڑکی میں سے دیکھ رہا ہوں چاند کی لطیف کرنیں بوڑھے پیپل کے پتوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی سبز گھاس پر چتکبرے دھبوں کی شکل میں ناچ رہی ہیں۔ اس سے دور گھرے سیاہ درختوں کے درمیان مخملی گھاس پر بدمست عریاں چاندنی سو رہی ہے۔ کبھی کبھی بے تال جھینگر اپنے بھدی سروں میں میرا منھ چڑھانے لگتے ہیں۔ مجھے نیند بالکل نہیں آتی۔ میرے ذہنی بھوت ڈراونی شکلیں اختیار کرکے میرے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ دراصل یہ پریشانیاں کچھ نہیں محض میری اپنی تخلیق ہیں۔ اب جب کہ میں انھیں ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں تو میں اپنے ارادوں میں ہمت اور اولوالعزمی کی کمی پاتا ہوں۔

میرا دماغ ابھی تک زور زور سے کام کر رہا ہے نہ جانے یہ کیا سوچتا رہتا ہے جس وقت یہ سوچتا ہے تو میرا شعور پوری توجہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ پھر چند ہی لمحوں بعد ایک اور خیال ذہن کی تاریکیوں میں سے نکل کر اس کے ساتھ لپٹنے لگتا ہے حتیٰ کہ یہ خیالات گلو کی بیل کی طرح ایک دوسرے میں اس قدر غلط ملط ہو جاتے ہیں کہ مجھے یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں دراصل کس چیز کی بابت سوچ رہا تھا۔ دھک دھک۔ دھک۔ میری ذہنی نبض ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہے اور میری ذہنی بے چینی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تم سمجھ رہی ہو کہ میں بہک گیا ہوں۔ نہیں میں تمھیں اپنی ذات کے بہت قریب لانا چاہتا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کروگی۔ مجھے تمھاری پاک اور بے لوث محبت کا یقین ہے۔ میں فضا میں تمھارے لرزتے ہوئے

پتلے پتلے کیف آور سرخ سے ہونٹ دیکھ سکتا ہوں۔ اس سے دور سمندر سے بھی زیادہ گہری اور سیاہ آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے متوجہ نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور تمہارے چہرے پر بالوں کی خوبصورت لٹیں بارہا ہٹانے کے باوجود بھی تمہارے دہکتے ہوئے سرخ گالوں کو چومنے کے لئے بیقرار ہیں۔ تمہارے لبوں پر وہی پراسرار مسکراہٹ ہے جس کا منبع اور وہانہ آج تک کوئی نہیں جان سکا۔ تمہاری آنکھوں میں پیار بھرا اضطراب ہے جو میری ان الجھنوں کو دور کرنے کے لئے بیقرار ہے۔

تم میری طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ تمہارے گلاب کی پتیوں کے نازک سے لب اب فضا میں کپکپا رہے ہیں۔ تمہارے گورے گورے ہاتھ اندھیرے میں سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور میرے سوچنے سمجھنے والے دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ دھک دھک میری ذہنی نبض آہستہ چلنے لگتی ہے۔ کمرے میں پڑی ہوئی دھندلی چیزیں ہلکے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہیں۔ چاندی کی نازک کرنیں میری بند آنکھوں کے پپوٹوں میں سے ایک دھندلی چمکدار لکیر کی طرح دکھائی دیتی ہیں میری ذہنی ہلچل ایک پرلطف سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے مجھے اپنی پیشانی پر صرف تمہاری نرم نرم انگلیوں کا احساس ہوتا ہے اور تمہارا پیار سے جھکا ہوا چہرہ مجھے بند آنکھوں کے اندھیرے میں اور بھی صاف طور سے دکھائی دیتا ہے۔ پھر ایکدم تمہارے ہوشربا گرم گرم ہونٹ بڑھ کر میری پیشانی کو چوم لیتے ہیں۔ میرے جسم کی خفیوں کو، میری ذہنی کمزوریوں کو میرا چنچل سے بھرا دماغ دور کہیں سوچ رہا ہے۔ میرے ناگوں کی طرح پھنکارتے ہوئے خیالات تمہارے گرم گرم ہونٹوں کی موسیقی سن کر میری دماغی پٹاری میں چپ چاپ سو جاتے ہیں۔

تمھارے ہونٹوں کا لمس میرے جسم میں گھلتا چلا جاتا ہے اور مجھے صرف اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تم میرے قریب ہو — بہت قریب میں تمھیں چھو کر محسوس کر سکتا ہوں مجھے ناز ہے کہ مجھے تمھاری بیش بہا محبت کا فخر حاصل ہے مجھے اس کا مکمل احساس ہے کہ میں تمھیں پا کر اپنی کمزوریوں پر ضرور حاوی ثابت ہونگا۔

دراصل مجھ میں بڑی کمزوریاں ہیں۔ بہت بڑی۔ تم کہو گی کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔ شاید میری دیوانہ وار محبت تمھیں مجبور کر رہی ہے کہ تم میری کمزوریوں کو نظر انداز کر دو۔ لیکن آج تم مجھے ایک مختلف انسان پاؤ گی — ایک ایسا انسان جسے باوجود اس قدر قربت کے تم کبھی نہ جان سکیں۔ ہر انسان کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک ظاہری دوسری باطنی ایک وہ جو اس کے خیال کے مطابق دنیا کو جاننی چاہیئے اور دوسری وہ جس کے متعلق وہ خود واقف ہے اور جو اکثر کم خوردہ اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ انسان اپنی باطنی شخصیت کے گرد ایک مضبوط خول بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی کمزوریاں صرف اسی تک محدود رہیں۔ تم نے ابھی تک میرا ظاہری پہلو دیکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک اپنی دوسری شخصیت تم سے چھپاتا رہا ہوں لیکن یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ امید ہے مجھے تم معاف کر دو گی لیکن آج میں یہ خول اتار کر پھینک دینا چاہتا ہوں تاکہ تم مجھے قریب تر محسوس کر سکو۔

جہاں تک میرا خیال ہے میری کمزوریوں کی جڑیں میرے فطری طور پر احساساتی ہونے میں ہیں۔ میں ہر چیز کو نہایت شدت سے محسوس کرتا ہوں اپنے آپ کو ہر فضا کا جز بنا لیتا ہوں۔ تم مسکرا رہی ہو۔ تم شاید کہو گی یہ بھی کوئی کمزوری ہے

تمھارے خیال کے مطابق شائد میں کہتا کہ میں شراب پیتا ہوں، جوا کھیلتا ہوں، لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا ہوں تو تمھیں اس قدر اچنبھا نہ ہوتا۔ نہیں میں ان سب چیزوں سے کوسوں دور ہوں۔ مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں جیسے کہ میں نے کہا کہ میں فطری طور پر احساسات کی لہروں میں بہہ جاتا ہوں، اور شاید موجودہ دنیا میں احساساتی ہونا سب سے بڑی لعنت ہے۔ دنیا کے چلتے پھرتے مہذب گنواروں میں حساس ہونا اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنا ہے۔

مجھے دوسروں کے جذبات کو مجروح ہوتے دیکھ کر رحم آنے لگتا ہے میں ہر وقت اپنے آپ کو دوسروں کے حالات کے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہوں میں یہ محسوس کرتا رہتا ہوں کہ ایک انسان کو کسی خاص حالات کے تانے بانے میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے اور میرا یہ جنون اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس سے اکثر میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے اکثر فائدہ اٹھایا ہے میں ان کے فریب کو بھی حقیقت جان کر بڑے سے بڑا دھوکا کھا جاتا ہوں صرف اس لئے کہ میں اپنے جذبۂ رحم پر قابو نہیں پا سکتا۔ مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ موجودہ تہذیب اور اس کے متعلق لمبی چوڑی ڈینگیں موقعہ پڑنے پر ہر شخص بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔

موجودہ نظام میں اصولوں کے لئے بہت کچھ کہا سنا جاتا ہے لیکن قدم قدم پر یہی اصول بڑی بے رحمی سے توڑے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ پر اپنے جذبات کا واسطہ دے کر دوسروں کے جذبات کو دیدہ دانستہ کچلا جاتا ہے۔ آجکل صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس نے اپنی شخصیت کے گرد احساس کو روکنے کے لئے نہایت مضبوط خول بنا لیا ہو۔ میں یہ سب سوچتا ہوں اور میری الجھنیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

پھر میں اپنی شخصیت کے گرد نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اپنی اونچی تعلیم، اپنی ترقی
کی راہ میں سخت رکاوٹ ڈالتی نظر آتی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے میرے
احساس کو اور بھی حساس بنا دیا ہے۔ میں سوچتا زیادہ ہوں اور عمل کم کرتا ہوں۔ تعلیم کا
مقصد تو عام طور پر قوت ارادی کو مضبوط کرنا ہے لیکن میں جیسے ہر دوراہے پر رک جاتا ہوں
اور سوچنے لگتا ہوں کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ میں ہر راستہ کے متعلق ہر مسئلہ
کے پہلوؤں پر غور کرنے لگتا ہوں اور کئی بار صرف اسی بنا پر ٹھوکر کھاتا ہوں۔ صرف اس لئے
کہ میرا احساس دماغ ہر چیز کے نشیب و فراز کے متعلق قیاس آرائیوں میں کھو جاتا ہوں۔ دراصل
مجھ میں قوت ارادی کی کمی بھی حساس ہونے کا نتیجہ ہے۔ میں دنیا کی نظروں میں تعلیم یافتہ ہوں
میرے پاس دو ڈگریاں اور بے شمار سرٹیفکیٹ ہیں لیکن میری حالت بالکل اس بچے کی طرح
ہے جسے کھلونوں کی ایک بڑی سی دکان کے سامنے کھڑا کر دیا جائے اور صرف ایک کھلونا
چننے کے لئے کہا جائے۔ بچے کی نظر کبھی خوبصورت رنگین ہوائی جہاز کی طرف جاتی ہیں
جس کے ربڑ کے بنے پہیئے ہیں اور جو فرش پر نہایت تیزی سے دوڑ سکتا ہے پھر وہ اس
سپاہی کی طرف دیکھتا ہے جو گھٹنے ٹیکے اپنی بندوق چاروں طرف ایک عجب شان سے
گھماتا ہے اور پھر اس کی نگاہیں اس ریل گاڑی میں الجھ جاتی ہیں جو نہایت تیزی سے
سے پٹڑی پر چکر لگا رہی ہے اس سے دور وہ ایک چلمچی میں دخانی جہاز کی طرف دیکھتا ہے
جو دھوئیں کی لکیر کھینچتا کھٹ کھٹ کرتا پانی میں ادھر ادھر دوڑ رہا ہے —— اور
وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اس کے ننھے سے ذہن میں دخانی جہاز، ریل گاڑی، بندوق
چلاتا ہوا سپاہی اور رنگین ہوائی جہاز کی خوبصورتی ایک بجلی کی طرح کوند جاتی ہے اور اس
کی آنکھیں چکا چوند رہ جاتی ہیں وہ جانتا ہے کہ جو کھلونا بھی مانگے اسے اسی وقت مل سکتا ہے

وہ پھر ٹھٹکتا ہے، غور کرتا ہے چاروں کھلونوں کی خوبصورتی کو تولتا ہے لیکن کوئی فیصلہ
نہیں کر پاتا۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر تعلیم کے مجھے اور اس بچے میں کوئی
فرق نہیں ہم دونوں ایک ہی مرض کا شکار ہیں۔ مستقبل کی قیاس آرائیاں مجھے کچھ بھی فیصلہ
نہیں کرنے دیتیں، میں سوچتا ہوں اور میرا سوچنے بوجھنے والا دماغ ان خیالات کی پیچیدگیوں
میں الجھا کر رکھ دیتا ہے میرے ذہن میں کہر نما خفیف سا پردہ لہراتا رہتا ہے اور اس سے
پرے مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا اس پردے کی ہین جالی میں مجھے مستقبل کی خفیف جھلک
سی دکھائی دیتی ہے جنہیں یہ پردہ جلد ہی ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ سب اس لئے نہیں کہ مجھ
میں خود اعتمادی کی کمی ہو مجھے یقین ہے کہ میں جو راہ منتخب کروں گا مجھے اس میں ضرور
کامیابی ہوگی۔

پھر کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کاش میں ایک گنوار ہوتا۔ ایک کم پڑھا لکھا شخص
سوچتا کم اور عمل زیادہ کرتا ہے جس کے لئے زندگی کبھی اپنے ہاتھ پھیلائے سائن
پوسٹ کی طرح دوراہے سہ راہے یا چوراہے کی شکل میں نہیں کھڑی ہوتی جس کے لئے
صرف ایک راہ ہے اور اسے معلوم ہے کہ اسے ہر صورت میں اسی راہ پر ہی چلنا ہے
کاش کہ میری زندگی میں ایک ایسا تند طوفان آئے جو ان خیالات کے جالوں کو اپنے
ساتھ اڑا کر لے جائے یا پھر میری قوت ارادی اس زور سے جھٹکے کہ میرے دماغ کا
کہر نما پردہ اس کی گرمی سے دم بھر میں پگھل کر رہ جائے یا پھر میرا ذہن اس قدر بےحس
ہو جائے کہ میری دماغی موجیں بالکل شانت ہو جائیں اور پھر میرے ذہنی ایوان ایک
سی موسیقی سے گونج اٹھیں تاکہ یہ پھنکارتے ہوئے ناگ چپ چاپ سو جائیں۔

خاموشی رات کو نگلے جارہی ہے۔ چاند کی نوکیلی کرنیں دھند کی ہلکی چادر کو پھاڑنے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں، سردی ہر لمحہ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ تم میری طرف متوجہ نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تمھارا ذہن کیا سوچ رہا ہے۔ تمھیں میرے ساتھ انتہائی ہمدردی ہے۔ تمھاری نظروں میں پیار اور رحم کا جذبہ لہرا رہا ہے تم یہی سوچ رہی ہو نا کہ میں ان ذہنی کشمکشوں سے نجات پا جاؤں میرا سوچنے سمجھنے والا دماغ سو جائے میرا ابلتا ہوا ماضی کا لاوا ٹھنڈا پڑ جائے، میری قوت احساس مر جائے تاکہ میں امن اور چین کی زندگی بسر کر سکوں اور اپنے لئے صحیح راستہ تجویز کر دوں شاید میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ......

لیکن نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس روز انسان میں قوت احساس مر جائے گی سوچنے سمجھنے والا دماغ بیکار ہو جائے گا اس روز انسانیت نیست و نابود ہو جائے گی ہم اپنے آپ کو انسان کہلانے کے قابل نہ رہیں گے۔ ہم پہلے ہی چلتے پھرتے انسان لوہے کی کلیں بن چکے ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔ قوت احساس ہی انسانیت کا دوسرا نام ہے میں چاہتا ہوں کہ ہر انسان میں قوت احساس اس قدر بڑھ جائے تاکہ وہ دوسروں کی مصیبتوں کا صحیح اندازہ لگا سکے وہ ہر چیز دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکے جس روز ایسا ہو جائے گا دنیا کی تمام لڑائیاں جھگڑے ختم ہو جائیں گے خود غرضی کے دور دورہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انسان صحیح معنوں میں انسان بن جائے گا۔ قوت احساس امر ہے۔ اسے امر رکھنے کی ضرورت ہے۔

میں اپنی پیشانی پر تمھارے ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہا ہوں یہ آہستہ آہستہ میری ذہنی الجھنوں کو جذب کر رہا ہے مجھے اپنے ذہنی ایوانوں

میں احساسات کی موجوں کا شور مدھم ہوتا سنائی دے رہا ہے اور میرا ذہنی وجود جیسے منجمد ہو کر آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہا ہے —— میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں میں اپنی پیشانی پر شبنم آلود گھاس کی طرح تمھارے گرم گرم ہونٹوں کی راحت بخش نمی محسوس کر رہا ہوں۔ تمھارے نرم ہاتھ مجھے تھپکیاں دے کر کہہ رہے ہیں۔
سو جاؤ —— سو جاؤ —— سو جاؤ۔

سوکھا جھرنا

(صغیر احمد صوفی کے نام)

نواب یاس کے عالم میں ڈوبا اپنی بڑھی ہوئی کھردری ڈاڑھی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا ہوا پارک کے کونے میں لگے ہوئے نل کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جہاں قطرہ قطرہ پانی نل کے لبوں سے رستا ہوا نیچے گڑھے کے جمع شدہ مٹیالے پانی میں گر کر لہریں پھیلا رہا تھا۔ آج وہ پھر بھوکا تھا۔

پچھلے تین دنوں میں اسے مٹھی بھر چنے کے سوا کچھ کھانے کو نہ مل سکا تھا اس کے سوکھے ہوئے بدن میں طاقت بالکل ختم ہو گئی معلوم پڑتی تھی اس کا تجربہ تھا کہ ہمیشہ تیسرا فاقہ نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اگر آج ــــ صرف آج کا دن کسی طرح سے گزر جائے تو شاید اسے اگلے روز اتنی دقّت نہ ہو بھوک کی ٹیسیں اس کی انتڑیوں کو بری طرح بلو رہی تھیں۔

اس کے لبوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ پھڑ پھڑانے لگی۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے نل سے رستے ہوئے پانی کے قطرے اسے بلا رہے ہوں وہ ہمت کر کے بنچ سے اٹھا اس کے قدم ایک لمحہ کے لئے لڑکھڑائے اور پھر نہ جانے وہ کیسے لپک کر نل کے پاس پہنچ گیا اس نے جلدی سے نل کا ہینڈل گھمایا اور شوں شوں کرتا گرم پانی باہر امڈ پڑا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ ایک لمحہ کے لئے لرزا اور پھر اس نے کچھ عرصے کے لئے گرم پانی بہہ جانے دیا قدرے ٹھنڈا پانی کے آتے ہی وہ اس پر اس بے صبری سے ٹوٹ پڑا گویا وہ نلکے کا تمام پانی ختم کر کے ہی دم لے گا کچھ عرصہ بعد اس نے ایک لمبی ڈکار لی۔ پانی اس کی اوک سے بہہ بہہ کر جھاگ پھیلاتا نیچے گرنے لگا۔ اب جب کہ خالی معدہ کچھ بھر گیا تھا اس کے ہینڈل پکڑے ہوئے ہاتھ کو یکایک تپش کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے دوسرے ہاتھ سے ہینڈل پکڑ کر اسے پانی میں بھگو دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھوں کی انگلیوں سے پانی کے قطروں کو جھاڑتا ہتھیلی کی پشت سے مونہہ پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

نلکے کے پاس والی بنچ پر اب دھوپ آگئی تھی۔ گرمی کی شدت بھی اب بڑھتی جا رہی تھی وہ اب بڑے سے نیم کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی بنچ پر آ کر بیٹھ گیا اور پھر سستانے کے لئے اپنی کہنی کا سہارا لئے لیٹ گیا پارک میں گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے بچے زیادہ دھوپ کی وجہ سے اب شائد اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پارک ایک دم بہت خاموش ہو گیا تھا سامنے سڑک پر بھی اب کوئی اکا دکا ہی دکھائی دے رہا تھا۔

نواب! لیٹے لیٹے اسے اچانک اپنے نام کے بے تکے پن کا خیال آیا اس کے موٹے موٹے بھدے سے ہونٹ ایک طنزیہ مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ کون سی بات تھی اس میں نوابوں جیسی جسے دیکھ کر ماں باپ نے اس کا نام نواب رکھدیا تھا! نواب کیا یوں ہوا کرتے ہیں؟ فاقوں کے ہاتھوں اس طرح مجبور! لیکن ایک بات اس میں واقعی نوابوں والی تھی! خودداری اور غیرت! وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے موت کو ترجیح دیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ بھیک مانگنے کی بجائے گاڑھے خون کی کمائی زیادہ پسند کرتا تھا!

دور کہیں سے کسی تانگے کے گھوڑے کی گردن میں بندھے ہوئے گھنگروؤں کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ یہ آواز اس کے لاشعور کی بھول بھلیوں میں سے گڈمڈ ہوکر ابھرتی اور ڈوبتی ہوئی اس کے کسی سوئے ہوئے احساس کو جگانے لگی۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے باپ کے پاس بھی ایک خوبصورت گھوڑا تانگہ تھا اور جب وہ کوچہ قاسم جان میں رہتے تھے وہ خود اصطبل کی چار دیواری میں تازہ کٹی ہوئی گھاس اور گوبر کی جانی پہچانی سوگندھ کے درمیان پلا تھا۔ ایسے ہی تانگہ پر باپ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر تانگوں کے پہیوں میں چابک اڑا کر اس نے تانگہ چلانا سیکھا تھا۔ پڑپڑ، پڑپڑ — شاباش شیرا — ہئیں جواب میرے شیر کا — ٹپاٹپ، ٹپاٹپ — چل بٹیا رکتا کیوں ہے! — کتنا اصیل گھوڑا تھا مشکی رنگ تھا اس کا! اس سستے زمانے میں بھی دو سو کا آیا تھا لیکن کیا مجال جو اس نے کبھی کسی دوسرے تانگے کو آگے نکلنے دیا ہو۔ پھولوں کی سیر کے میلے میں، دریا گنج سے مہرولی کے درمیان، وہ بیسوں بار تانگوں کی دوڑ میں ہمیشہ اول آیا تھا! چابک کا اشارہ

پاتے ہی ہوا ہو جاتا! کسی بازار سے گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں اٹھی کی اٹھی رہ جاتیں
کسی اسٹینڈ پر کھڑا ہوتا تو سواریاں ان کے تانگے کے لئے ٹوٹ پڑتیں لیکن یکایک فسادات
کی گہری آندھیاں آئیں اور اس بھاگتے ہوئے تانگے کا دھرا نکل گیا اور ایک پہیہ لڑھکتا
ہوا بہت دور جا پڑا ——— سواریاں گر گئیں اور اس کے ماں باپ فسادات کے گہرے
دھوئیں میں کھو گئے۔ وہ خود کئی دنوں تک مہرولی کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں
میں چھپا رہا۔

اور جب وہ دو سال کے بعد دہلی کی سڑکوں پر نکلا تو تانگے کے بڑے بڑے
ڈنڈوں والے پہیے" اپتلے پتلے سلاخ دار پہیوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اب وہ اپنے
مشکی گھوڑے کی بجائے خود جتا تھا ——— رکشا کے پیڈلوں پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتا
پسینے کی لمبی لمبی دھاریں اس کی ننگی کمر کو گدگداتیں اور کوئی بھدی کرخت آواز ڈانٹتی
" اوے چھیتی کر! گڈی کھنچ جائے گی" (جلدی کرو ورنہ گاڑی نکل جائے گی) اور یہ
ڈانٹ اس کے تھکے ہوئے جسم کو اور بھی تیزی سے رکشا کھینچنے پر مجبور کرتی ——— گویا وہ
انسان نہ تھا محض ایک کل پرزہ تھا! چلچلاتی دھوپ میں ڈھیروں برستے پانی میں ٹھٹھرتے
جاڑے میں سائیکل کی چین کراہتی رہی پیڈل چرچراتے رہے اور پہیے گھومتے رہے
——— اور پھر ریڑھ کی ہڈی کے درد اور کھانسی نے اسے آگھیرا۔

جب اسے بیماری سے فراغت ہوئی تو اس کی مختصر پونجی اس کی نذر ہو چکی
تھی۔ رکشا چلانے کے اب وہ قابل نہ تھا، گھوڑا تانگہ تقدیر سے ہی اس کے بس
کی بات نہ تھی۔ خوانچہ لگانے کے لئے اس کے پاس سرمایہ اور عقل دونوں نہ تھے
نوکری کے لئے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ ایک دن وہ اپنے دوست غفور سے

کے پاس بیٹھا تھا جو بیکار رہنے کی وجہ سے اکثر پیڑی پر نیم کی چھاؤں میں سارا دن ایک گھسی ہوئی پرانی سی تاش چند لوگوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ تاش کے پتوں کے درمیان اس نے ایک لمبی نظر نواب کے بے بس اور مایوس چہرے پر ڈالی اور بولا

"ارے تو فکر نہیں کر راجہ! تیرا شام تک بندوبست کرادونگا!"

"لیکن کہاں غفورے؟"

"ابے!" غفورا تنک کر بولا — "تجھے آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے؟"

"دیکھو غفورے میں کوئی ایسا ویسا کام نہیں کرونگا!"

"ارے جا! تجھ جیسے کھنڈی سے ہو بھی کیا سکتا ہے! خون پسینے کی کمائی ہوگی بیٹے!" اس نے ترپ چال چلتے ہوئے کہا۔

"سچ؟"

"ابے ہاں! دیکھو جی، یہ بازی ہماری ہے۔ ایسے بے ایمانی نہیں کرنے دونگا —" اس نے اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے گنجے شخص سے کہا۔

"شام کو تین بجے یہیں آجائیو نواب!"

اور نواب کو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک دم ساری کائنات اس کے قدموں میں آگری ہو۔ اس کے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اسے بھی کوئی کام مل سکتا ہے۔ اس نے بازار کے دو نہیں بلکہ چار چکر لگائے۔ ان تمام چیزوں کو نہایت غور سے دیکھا جنھیں وہ خریدنا تو چاہتا تھا لیکن جن کو خریدنے کے لئے اس میں توفیق نہ تھی۔ آج تو اس نے ہمت کر کے ان تمام چیزوں کے بھاؤ

بھی پوچھ ڈالے۔ تین بجنے سے پہلے ہی وہ غفورے کے پاس پہنچ گیا۔ غفورے نے تاش کے پتوں پر سے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو آ گیا، نواب؟" اور اس نے باقی ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"لو بھئی۔ یہ آخری بازی ہے۔ جو جیتا تھا سب ہار گیا ہوں!" بازی ختم ہوتے ہی وہ اس کے ساتھ چل دیا —— چلتے چلتے اس نے جیب میں سے پیسے نکال کر گنے۔" ہات تیرے کی۔ چار گھنٹے کی ہاتھ گھسائی کے بعد صرف آٹھ آنے ہی ہوئے! خیر چلو کچھ رئیسی ہی ہو جائے!" اور اس نے پنواڑی کی دکان سے چار مینار کا آدھا پیکٹ مانگا۔ پنواڑی نے اسے پانچ سگرٹ تھما دیے۔ غفورے کا ہاتھ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس نے چہرے پر خفگی کے آثار پیدا کرتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔" اماں تھوک کے گاہک کے ساتھ بھی ایسا سلوک! یہ ڈبیا کیا سسرال لے جاؤ گے؟" اور اس کے ہاتھ کھلے کے کھلے رہے جب کہ پنواڑی نے سگریٹ اٹھا کر ڈبیہ میں بند کر کے اس کے ہاتھ میں نہ رکھ دیئے۔ اس نے ایک سگرٹ نواب کو دیا اور دوسرا خود لیتے ہوئے ڈبیہ کو نہایت حفاظت سے بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ دونوں نے سلگتی ہوئی رسی سے سگرٹ جلایا اور کش لیتے ہوئے کئی تنگ گلیوں میں سے گھومتے ہوئے کناٹ پلیس میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑی سی بلڈنگ کے پاس آ نکلے۔

"لو ہسپتال آ گیا!" غفورے نے کہا۔

"ہسپتال؟ یہاں کیا کریں گے؟" نواب نے پوچھا۔

"کبھی کبھی ہسپتال بھی غریبی کے مریضوں کو تندرستی دیتا ہے!" پھر غفورے رک

کر بولا۔ "میں بھی سخت ضرورت پڑنے پر کبھی کبھی یہاں آجاتا ہوں!"

"کیا کرنے؟"

"خون دینے! یہ پرائیویٹ ہسپتال ہے اس لئے پیسے بھی اچھے ملتے ہیں اور اگر خون کچھ کم ملنے والی قسم کا ہو پھر تو پو بارہ ہیں! لیکن یہ آسانی سے تیار نہیں!"

وہ اندر گیلری میں چند اور لوگوں کے پیچھے لائن میں بیٹھ گئے نواب نظریں گھما کر آس پاس دیکھتا رہا۔ کاربالک ایسڈ۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی اور دوسری کئی دواؤں کی ملی جلی بدبو اس کے نتھنوں میں رینگتی رہی۔ گیلری کے دونوں طرف کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہے اور ان میں دو تین نرسیں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کھٹ پٹ کرتی دکھائی دیتی رہیں۔ دفعتاً غفور سے نے اسے جھنجھوڑا۔ سامنے ایک لمبا سا سفید کوٹ پہنے ایک بلند قامت شخص کھڑا تھا اور وہ اسے تاک رہا تھا۔

"غفار یہ بھی خون دینے آیا ہے کیا؟" اس کی ایک آنکھ پتھر کی تھی اور وہ دوسری آنکھ نہایت تیزی سے جھپکا رہا تھا۔ نواب کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی پھیل گئی۔ اس نے گھبراہٹ سے غفار کی طرف دیکھا۔ غفور ذرا سا مسکرا دیا اور نواب نے سر ہلا کر "ہاں" کہہ دیا۔

"تمہارا نام؟" وہ ضرورت سے بلند لہجے کے اعتبار سے پنجاب سے آیا معلوم ہوتا تھا۔

"نواب"

"چلو، پہلے تمہارا خون ٹیسٹ ہوگا!" اس نے نواب کو شانہ سے پکڑ کر اٹھا دیا

نواب کے لئے یہ مضبوط گرفت بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا اس کی انگلی کی پور میں سرنج کی سوئی سے چھید کر دیا گیا اور سوئی نے خون کے دو ایک قطرے ایک کانچ کے ٹکڑے پر اگل دیئے۔

"شاباش" اس نے زور سے نواب کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "تم باہر بیٹھو میں ابھی آتا ہوں!" اور وہ دوسرے کمرے میں خون ٹیسٹ کرنے کے لئے چلا گیا۔

نواب پیٹھ سہلاتا غفار کے پاس آ گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" غفورے نے پوچھا۔

"بھئی غضب کا آدمی ہے تمہارا دوست!"

"کون؟ یہ کمپاونڈر بخشی صاحب؟"

"ذرا سخت ہاتھوں سے شاباش دیتے ہیں! نہ کسی کی کمر کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے ہاتھوں کا۔!"

"ہاں ذرا آواز اور ہاتھوں کے اعتبار سے سخت آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن ہے دل کا صاف۔ ایک بات ہے نواب، آدمی ہے بڑے کام کا!" اس نے نواب کو اپنی جگہ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا مل آؤں!"

نواب ماحول کا جائزہ لینے لگا چند ہی لمحوں میں غفورا واپس آ گیا۔ اس کے چہرے سے خوشی اور مسکراہٹ ٹپک رہی تھی۔

"ابے نواب!" اس نے ہنستے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "ارے تیرا خون تو بہت اچھا نکلا۔ کسی سے کہنا نہیں۔ بخشی صاحب نے مجھے چوری سے بتا دیا

ہے: تمہاری تو خاصی آمدنی ہو سکتی ہے!"

نواب محض مسکرا دیا۔

جب نواب خون دے چکا تو بخشی صاحب نے گرم گرم چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: "نواب تم اپنا مکمل پتہ لکھا دو۔ وقت بے وقت کام آئے گا۔"

"ضرور بخشی صاحب میں ویسے بھی پتہ کرتا رہوں گا!"

اور پھر، جیسے غفورے نے کہا تھا، نواب کے لئے واقعی آمدنی کا راستہ کھل گیا بخشی صاحب والا ہسپتال دوسرے ہسپتالوں کو خون مہیا کرتا تھا اور کبھی کبھار تو رات گئے کسی مریض کے رشتہ دار سرکاری ہسپتال میں اپنی ضرورت کا خون نہ ہونے کی وجہ سے اس دوکان نما ہسپتال کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔ ہاتھ جوڑتے تھے، ایڑیاں رگڑتے تھے۔ اور منھ مانگے تگنے چوگنے دام دینے پر بھی خوش خوش چلے جاتے تھے۔

تین چار ہفتے کے بعد بخشی صاحب نے اسے ہسپتال میں خون دینے کے لئے پھر بلایا تھا۔ ایک سکوٹر سوار کی بس کے ساتھ ٹکر ہو گئی تھی اور اسے زیادہ چوٹ آجانے کی وجہ سے خون دینے کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے صرف نواب کا ہی خون ایسا تھا جو اسے زندگی دے سکتا تھا۔ پھر چند دنوں کے بعد ایک زچہ کو اس کے خون کی ضرورت پڑ گئی اور پھر رفتہ رفتہ وقت نے اسے خود مجبور کر دیا کہ وہ مہینے دو مہینے کے بعد خود خون دینے کے لئے ہسپتال کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

دو تین ہفتے ہوئے جب وہ خون دینے کے لئے گیا تھا تو بخشی صاحب نے خون لینے کے

بعد اپنی مخصوص بلند آواز میں کہا تھا۔۔۔ "ادے نواب کے بچے تو خون تو بڑا دے ما ہے!"
بخشی صاحب کی دونوں آنکھیں اس پر جمی تھیں اور اس کے لئے فیصلہ کرنا نہایت مشکل
تھا کہ کون سی آنکھ بھینگی تھی۔

"لیکن نواب تیرے جسم میں خون اتنی تیزی سے بن نہیں رہا!" اور پھر بخشی صاحب
کی بائیں آنکھ زور زور سے جھپکنے لگی۔" ادے اگلے تین مہینے تک ہسپتال کا رخ نہیں
کرنا۔ سمجھے!"

اس کے بعد بخشی صاحب نے اسے سمجھایا تھا کہ انسان کے جسم میں سے تھوڑے
تھوڑے عرصے بعد ذرا سا خون نکال کر کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دیا جائے
تو اس سے دینے والے کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ کیونکہ صحت مند آدمی کے جسم میں اتنا
ہی خون پھر بن جاتا ہے لیکن اگر کسی کو پوری غذا نہ ملتی ہو یا کوئی بیماری ہو تو پھر اس کا
خون اتنی تیزی سے نہیں بنتا اور اس کو اپنا خون کسی اور کو نہیں دینا چاہئیے۔ بخشی
صاحب کی رائے میں نواب کو غذا پوری نہیں مل رہی تھی اس لئے کچھ عرصہ اپنا خون بیچنا
اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ یہ سن کر نواب کا چہرہ افسردہ ہو گیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے
ہسپتال سے نکل آیا تھا۔

نواب کو پارک میں بیٹھے بیٹھے تیسرا پہر ہونے کو آ گیا تھا۔ بنچ کے ایک سرے پر
دھوپ بھی آ گئی تھی۔ اسے شدت کی بھوک پھر ستانے لگی تھی وہ آہستہ سے اٹھ کھڑا
ہوا اور اس کے لڑکھڑاتے قدم کسی نامعلوم منزل کی طرف اٹھنے لگے۔ کونے پر ایک
چنے والا بیٹھا تھا۔ بھنے چنوں کے درمیان انہیں گرم رکھنے کے لئے مٹی کی ہنڈیا میں سے

اُپلوں کا دھواں آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے نگاہیں پھیریں تھوڑا دور آگے ایک چائے والا ڈبل روٹی اور کلچے لئے بیٹھا تھا۔ گرم چائے اور ڈبل روٹی کی بھوک بڑھا دینے والی سوندھی سوندھی خوشبو نے اس کے اندر ایک ہیجان برپا کر دیا۔ اس نے جلدی جلدی چلنا شروع کر دیا۔ اس کی بھوک گو یا ہر نکڑ اور موڑ کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پھیری، چاٹ گنڈیری اور مونگ پھلی کے کئی خوانچے اس کی نگاہوں میں تیزی سے رقص کرنے لگے اس کے قدم اور تیزی سے بڑھنے لگے اور جب وہ رکا تو بخشی صاحب والا ہسپتال عین سامنے تھا۔

وہ احاطے میں سے گزرتا ہوا گیلری میں لگی ہوئی ان بنچوں پر پہنچ گیا جہاں وہ کئی بار آ چکا تھا اس کے آگے دو تین اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ بڑی بے صبری سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور بخشی صاحب ایک پرچی لئے کسی اپنے دھیان میں ڈوبے اس کے آگے بیٹھے ہوئے شخص کے قریب آ کر رک گئے۔

"اوئے نیڈی داس تیرا خون تو بڑا اچھا ہے!" بخشی صاحب کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا گو یا نیڈی داس ان کی نہایت قریبی جان پہچان کا تھا۔ "ہمارے ہاں تو بس دو ایک ہی ایسے خون والے ......" باتیں کرتے کرتے ان کی نگاہیں نواب کی طرف اٹھ گئیں ان کی پتھر کی آنکھ اس پرچی تھی اور دوسری آنکھ نہایت تیزی سے جھپک جھپک کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اوئے نواب تو؟ تو کس لئے آیا ہے؟ تجھے منع نہیں کیا تھا تین مہینے کے واسطے! بھاگ یہاں سے!"

اور نواب ایکا ایک غصے سے بھر اٹھا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور اس کا زرد چہرہ بھی خون کی سرخی سے دہک اٹھا۔ اس کی حاسدانہ نگاہیں نیڈی داس پر جمی تھیں: "میں سب سمجھتا ہوں بخشی صاحب! تمھیں میرا خون ہی چاہیئے نا؟ تم باہر تو نکلو میں تم سے نپٹ لوں گا!"

پکارتے ہیں یہ زمین و آسمان......

(سلطانہ حیات کے نام)

چیتن دیش کے کئی نوجوانوں کی طرح صبح کا اخبار پڑھ کر جھلا اٹھا تھا۔ نیفا کے محاذ پر والونگ ہماری فوج کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا ہماری کئی چوکیوں کو چینیوں نے تہ و بالا خاک کر دیا تھا۔ "ہندی چینی بھائی بھائی" اور پنچ شیل، کے نام نہاد پجاری خونخوار دانت نکالے ہوئے بھیڑیوں کے اصلی روپ میں سامنے آ گئے تھے۔ ہمارے بہادر جوان چینیوں کے امڈتے ریلوں کا مقابلہ نہ لاکر بھاری تعداد میں شہید ہو گئے تھے۔ لداخ کے محاذ پر چوشول کے ہوائی اڈے پر مسلسل گولے برسا کر اسے ناقابل استعمال بنا دیا گیا تھا۔ پچھلے پچیس تیس دنوں سے چینی آگے ہی بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ برف، پہاڑی راستے، خوراک کی کمی اور دشواریاں کوئی بھی چینیوں کے حملے کے زور کو کم نہ کر سکی تھی۔ دیش خطرے میں تھا۔ چینی اس حملے کی تیاریاں

ایک لمبے عرصے سے کر رہے تھے۔ اور ہماری فوج ہمارے نیتا ان تیاریوں سے بالکل غافل تھے۔ ہم نے ایک چالاک و عیار دوست کا اعتبار جو کر لیا تھا!

یہ درست تھا کہ چینیوں کا بہت بھاری جانی نقصان ہوا تھا۔ ہمارے ایک ایک جوان نے دس دس کو مار کر اپنی جان دی تھی لیکن چینیوں کو اپنے سپاہیوں کی زندگی کی پرواہ کب تھی! وہ تو انھیں ایندھن کی طرح بھٹی میں جھونکنا جانتے تھے۔ اسلحہ کی بجائے ان کی کثیر تعداد ہی ہمارے جوانوں پر بھاری ہوتی۔ تھاپا، جوگندر سنگھ، یوگندر ٹنڈن اور ان کے کئی بہادر ساتھی اس بڑھتے ہوئے ٹڈی دل کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دیش اور فوج کی نہ بھلائے جانے والی روایتوں میں قابلِ قدر اضافہ کر گئے تھے۔

چیتن کا خون ان تمام خبروں کو پڑھ کر کھولنے لگا اس کی آنکھیں جوش و غصے سے پرنم ہو گئیں۔ صحن کے کونے والے کمرے سے ایک نحیف اور پُر شفقت آواز اس کے کان میں آئی۔

"چیتن! بیٹا چیتن!" یہ آواز اس کی بوڑھی ماں کی تھی۔ اس آواز میں کتنی ہی آرزوؤں کی دھڑکن تھی، کتنی ہی تمنائیں چھپی ہوئی تھیں!

چیتن نے فوراً چونکتے ہوئے وہیں سے آواز دی

"آیا ماں!"

"بیٹے آج دکان نہیں جاؤ گے کیا! دیر ہو رہی ہے۔ میں نے تو تمہارا کھانا بھی تیار کر دیا ہے!"

چیتن یہ سن کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ واقعی آج دکان کو بہت دیر ہو گئی تھی اس کی سائیکلوں کی دکان تھی۔ دفتروں کا وقت ہو رہا تھا، اور اسی ٹائم پر ہی اس کی گاہکی

زوروں پر ہوتی۔ اسی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں سائیکل کے پہیوں میں ہوا بھروائی جاتی پنکچر لگوائے جاتے۔ بریکیں اور چین کی مرمت ہوتی، کبھی کبھی ٹیوبیں اور ٹائر تک بدلوائے جاتے اور اب تو چینی حملہ کی وجہ سے دفتر آدھ گھنٹے پہلے لگتے تھے۔

وہ جلدی سے رسوئی میں چلا گیا جہاں اس کی ماں کھانا پروسے بیٹھی تھی اس نے ہاتھ دھوئے اور رسوئی میں بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی نگاہیں ماں کی جھرّیاں آلود چہرے اور اس میں سے جھانکتی ہوئی پر شفقت آنکھوں کی طرف اٹھیں جن سے محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ شاید ہر ماں اپنے بچے کو کھانا کھاتے دیکھ کر اسی طرح پھولے نہیں سماتی، اور پھر وہ تو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا اس کی ساری عمر کی کمائی! تین بھائیوں بہن میں صرف وہی اکیلا بچا تھا۔ چیتن نے ماں کی بے چین نگاہوں سے اندازہ لگایا جیسے وہ اس سے کوئی اہم بات کہنے کے لئے ارادہ کر رہی ہو۔

"میں کل نند لعل کے ہاں گئی تھی، تمھیں ان کی لڑکی لاجو پسند ہے؟" ماں نے یہ بات اگر کسی اور وقت چھیڑی ہوتی تو وہ شاید اس پر کچھ رائے زنی کرتا لیکن اس کے دماغ میں اس وقت چینیوں کے خلاف سخت جھلاہٹ تھی۔

"ماں! مجھے نہیں شادی وادی کرنی ابھی!"

"اب تو جوان گبرو ہو گیا ہے۔ دس جماعتیں پاس کر لی ہیں۔ چار پانچ سال سے اپنی دکان کرتا ہے۔ گھر میں ایک بہو آ جائے تو میں بھی چند دن آرام کے کاٹ لوں گی!"

چیتن چپ چاپ اپنے ہی کسی خیال میں غرق جلد جلد نوالے منہ میں ڈالتا رہا اس نے ماں کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"ہو جائے گا ماں یہ بھی کبھی!" اور وہ یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

دکان پر پہنچ کر بھی اس کا دماغ کام میں نہیں لگا۔ اس کا ذہن ایک عجیب ادھیڑ بن میں لگا رہا۔ آج اس نے معمول کی طرح اپنے مستری سبحان اور اس کے شاگرد شکورے سے نہ کوئی ہنس ہنس کر بات کی، نہ کوئی مذاق کیا۔ وہ دونوں بھی چپ چاپ سائیکل کے پہیوں میں ہوا بھرتے رہے، پنکچر لگاتے رہے اور چیتن خود بھی ایک میکانکی انداز سے گاہکوں سے نپٹتا رہا۔

ایک سوال صبح سے اس کے ذہن میں کھلبلی مچا رہا تھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ اس راشٹریہ سنکٹ میں ہر نوجوان کی کیا ذمہ داری تھی! اور پھر اچانک اسے اس کا حل سوجھ گیا۔

"کہاں چل دیئے استاد!" سبحان نے اسے سائیکل پر تیار جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"شاید سبحان مجھے دیر ہو جائے تم دکان کا خیال رکھنا!" اور وہ سائیکل پر تیز تیز پیڈل مارتا روانہ ہو گیا۔ سبحان نے اسے جاتے دیکھ کر ایک ہاتھ سے سر کھجلاتے ہوئے اور دوسرے کی انگلیوں سے اپنی تپلی تپلی مونچھوں کو سہلاتے شکورے سے کہا۔

"آج پتہ نہیں استاد کس چکر میں ہے!"

چیتن سیدھا چھاؤنی میں واقع بھرتی کے دفتر میں پہنچا جہاں نوجوانوں کی ایک بھیڑ سی لگی تھی۔ دفتر کے باہر اسٹینڈ سائیکلوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے اپنی سائیکل کو دیوار کے سہارے کھڑا کر کے تالا لگا دیا۔ بھیڑ کے درمیان میں سے اس نے دیکھا کہ سامنے میدان میں بہت سے جوان نیکر یا انڈرویر پہنے ایک لائن لگائے ڈاکٹری معائنہ

کرا رہے تھے۔ دوسری طرف ایک فوجی افسر کے سامنے پیش ہو کر اپنا نام پتہ اور دیگر امور بتانے کے لیئے نوجوانوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی، گیٹ کے قریب باہر کی طرف ایک کینٹین تھی جو بھرتی ہونے والے نوجوانوں کو چائے اور ناشتہ پیش کر رہی تھی۔

میدان کھچا کھچ بھرے ہونے کی وجہ سے بہت سے نوجوان گیٹ کے پاس کئی گروہوں میں بٹے باتیں کر رہے تھے وہ بھی ایک گروہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

" اتنی اونچائی پر لڑنا کوئی آسان بات نہیں چودہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر سانس لینا تو مشکل ہو جاتا ہے پہاڑی راستے، برف اور پھر چینی جیسے ظالم اور بے حس دشمن! ان لوگوں نے تو مہینوں پہلے حملہ کی تیاری کی غرض سے فوجیں تبت میں بھیج رکھی تھیں تاکہ ان کے سپاہی موسم کی مشکلات کے عادی ہو جائیں!"

"یہ بالکل ٹھیک ہے!" ایک لمبے قد والے جوان نے مفلر کا پلو شانہ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ہاں نوبود ڈر کے علاقوں میں ٹھیک سے سڑکیں بھی نہیں ہیں۔ اس لئے لڑنا اور بھی کٹھن ہے۔ بغیر رسد وہتھیار کے لڑائی کیسے لڑی جا سکتی ہے؟ لیکن خیر ہم بھی بتا دیں گے کہ ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں؟"

"بھئی آخر یہ ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر کس مرض کی دوا ہیں؟"

"اجی جناب ذرا موسم خراب ہو جائے تو ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر پہلی چیزیں ہیں جو ناکارہ ہو جاتی ہیں!"

"بھئی ہتھیار اس کثرت سے تو چینیوں کے پاس بھی نہیں ان کی تو نڈی دل

والی ٹیکنیک ہے۔ کوریا کی لڑائی میں دیکھا نہیں کس طرح انھوں نے محض کثرت تعداد کی وجہ سے امریکنوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے! ۶۶ کروڑ کی آبادی میں دو چار لاکھ کام بھی آ گئے تو کیا ہرج ہے۔ ان کی آبادی کے لئے جینے یا مرنے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اگر جیتے رہے تو اور علاقہ مل جانے کی وجہ سے زندگی کچھ تو بہتر ہوگی اور اگر مر گئے تو موجودہ حالت میں جینے سے تو اچھے رہیں گے۔!"

"یہ قوم بھی بڑی ظالم قوم ہے ـــ کیا سلوک کرتے ہیں یہ فوجی قیدیوں کے ساتھ! برف پر بٹھا دیتے ہیں کپڑے اتروا کر! کبھی کبھی تو قطرہ قطرہ پانی گراتے ہیں سروں پر تا کہ بیچارے قیدی پاگل ہو جائیں یا تنگ آ کر فوجی راز اگل دیں!"

"فوج میں بھرتی ہونا تو جان ہتھیلی پر لے جانے کے برابر ہے۔ کون جانے واپس آنا نصیب ہو یا نہ ہو!"

ان باتوں کو سن سن کر جیتن کا جی گھبرانے لگا۔ وہ صبح سے نہایت جوش میں تھا لیکن اب اس کے ارادے ڈگمگانے لگے۔ اس نے ان تمام مشکلات پر اچھی طرح غور نہیں کیا تھا۔ اب وہ سوچنے لگا۔ اس کے حالات دوسروں کے حالات سے نہایت مختلف تھے۔ گھر میں اکیلی صرف ماں تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس نے ماں کو دن رات محنت کرتے ہی پایا تھا۔ شاید وہ صرف اسی کے لئے ہی جی رہی تھی۔ اس کے پتا جی بچپن میں ہی چیچک کی بیماری کی وجہ سے پرلوک سدھار گئے تھے گھر میں چند برتن ہی زندگی کا اثاثہ تھے۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے لوگوں کے کپڑے سی سی کر اسے دس جماعتیں پڑھایا تھا اور پھر اسے سائیکل کا کام سیکھنے لگا دیا۔ شروع شروع میں اسے کتنی مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں لیکن اب پچھلے دو ایک سال سے

اس کا کام کچھ جم گیا تھا۔ اب اس کی ماں اس کی گرہستی کے خواب دیکھ رہی تھی اور اب وہ فوج میں بھرتی ہونے جا رہا تھا — اس کی ماں کا کیا ہوگا؟ اس کے کاروبار کا کیا ہوگا؟ اب تو وہ مہینے میں ڈیڑھ دو سو روپیہ کما لیتا تھا! یہ ٹھیک تھا کہ سبحان اس کے گھر ہی کا آدمی تھا اور وہ اس پر پورا بھروسہ کر سکتا تھا لیکن پھر بھی ...... یہ بھرتی ہونے والے نوجوان تو اکثر بیکار تھے ان میں سے اکثر کے لئے فوج ایک روزگار تھا۔ پھر وہ کیوں اپنی جان کھپائے! اس کا دماغ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا؟

اچانک اسے اپنی پیٹھ پیچھے ایک ہلچل کا احساس ہوا۔ لوگ اِدھر اُدھر کسی کو راستہ دینے کے لئے سرک رہے تھے۔ چیتن نے بھی گردن آگے بڑھا کر دیکھا۔ دو لڑکے بھیڑ میں سے راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی عمر آٹھ دس برس کی ہوگی اور ان کے کندھوں سے سکول کے بستے لٹک رہے تھے۔ شاید وہ سکول ختم ہونے کے فوراً بعد بھرتی کا تماشہ دیکھنے ادھر نکل آئے تھے۔ ان میں بھی ایک عجب جوش و خروش معلوم ہوتا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد چیتن یہ دیکھکر دنگ رہ گیا کہ وہ دونوں سیدھا بھرتی ہونے والے جوانوں کی لائن میں سب سے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بھی اپنی قمیصیں اتار کر بستوں کے ساتھ میدان کے ایک کنارے رکھ دی تھیں۔ اب وہ دوسرے جوانوں کی طرح سینہ نکالے "ساودھان" کھڑے تھے۔

اچانک حولدار نے حکم دیا کہ جوان اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلا دیں۔ اور ان دونوں بچوں نے بھی اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ فوجی ڈاکٹر قطار کی دوسری طرف سے جوانوں کے ہاتھوں کا معائنہ کرتا چلا آ رہا تھا۔ بھرتی کا افسر جوان جوانوں کی

قطاروں میں گشت لگا رہا تھا۔ ان بچوں کو دیکھکر ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھک گیا اور پھر وہ سیدھا ان لڑکوں کے پاس آیا۔ بھیڑ میں سے اکثر لوگوں کی نگاہیں اس جگہ پر جمی تھیں جہاں یہ دونوں لڑکے اور بھرتی کا افسر کھڑے تھے۔

افسر نے قریب آکر ان دونوں بچوں کا سرتاپا جائزہ لیا۔ اسے متوجہ پاکر لڑکے اور بھی فوجی شان سے اکڑ گئے۔

"تم دونوں یہاں کیا تماشہ دیکھنے آئے ہو؟"

"نو سَر۔ ہم فوج میں بھرتی ہونے آئے ہیں!" بڑے لڑکے نے چستی سے جواب دیا۔

"ہم بھی چینیوں سے لڑنا چاہتے ہیں!" چھوٹا لڑکا بول اٹھا۔ بھیڑ میں سے کئی گردنیں انہیں غور سے دیکھنے کے لئے مڑ گئی تھیں۔

فوجی افسر ایسے جواب کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ اس نے ظاہراً اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تم۔ تم فوج میں کیا کروگے؟"

"جو سپاہی کرتے ہیں! ہمارے پتاجی بھی مورچے پر لڑنے گئے ہیں!"

فوجی افسر کی نگاہوں میں ان بہادر بچوں کے لئے پسندیدگی کا جذبہ تھا لیکن اس نے اسی طرح کرخت فوجی لہجے میں پوچھا۔

"لیکن تم دونوں اس قدر چھوٹے ہو کہ بندوق بھی نہیں اٹھا پاؤگے!"

"ہم۔ ہم۔" اور بڑے لڑکے کو گویا فوراً اپنی بیچارگی کا احساس ہوا۔

"ہم کم سے کم دشمن کی دو گولیاں تو ضائع کر سکتے ہیں۔" چھوٹے لڑکے نے بڑی نڈرتا

سے فوجی افسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

فوجی افسر کا سخت رعب دار چہرہ نرم پڑ گیا اور اس نے ان لڑکوں کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے شیر بچوں سے یہ کام لیں۔ بیٹے ہم تو چاہیں گے کہ ہمارے بچے بڑے ہو کر اس قابل بنیں کہ وہ اکیلے سو سو دشمنوں پر بھاری ثابت ہوں اور وہ زندہ لوٹ کر آئیں۔ ہم تمھیں خود گولی چلانا سکھائینگے!"

اور پھر اس نے اپنی گرجدار آواز میں حولدار کو آواز دی۔ اور قریب آنے پر اسے سرگوشی میں کچھ حکم دیکر ان بچوں کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔

چیتن کی طرح دوسری کئی نگاہیں ان دونوں بچوں پر جمی تھیں جو اب تجربہ کار پختہ سپاہیوں کی طرح حولدار کے قدموں سے قدم ملاتے چل رہے تھے۔

چیتن کی چھاتی فخر سے پھول گئی اور اب وہ مسکراتا ہوا بھرتی ہونے والے نوجوانوں کی لائن میں لگ گیا۔ اور بڑی بے صبری سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے پیچھے جوانوں کی لائن لمحہ بہ لمحہ لمبی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

کیپٹن پرساد

(جوگندر۔ پال کے نام)

کلب میں معمول کی طرح رونق تھی، ہلکا ہلکا آرکسٹرا بج رہا تھا جس کی دھن میں چند جوڑے ہال کی ڈھکی ہوئی، خوابیدہ روشنیوں میں ناچ رہے تھے۔ میں، مہندر چودھری اور سوبھیندرا کیپٹن پرساد کے انتظار میں بار کے ایک کونے میں اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ کیپٹن پرساد ہماری اس چھوٹی سی محفل کی جان تھا۔ فقرہ بازی ہو رہی تھی اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہماری میز پر سے قہقہے بلند ہوتے لیکن یہ قہقہے کیپٹن پرساد کے نا ہونے سے کھوکھلے معلوم ہو رہے تھے جیسے ان میں برجستگی اور بیساختہ پن نہ ہو، وہ رونق اور بھرپور مزاح نہ ہو جو ایسے قہقہوں کی جان ہوتا ہے۔

اور پھر دروازہ کھلا اور کیپٹن پرساد داخل ہوا۔ ہم اسے دیکھتے ہی ہیلو۔ ہیلو

پرساد، کہتے چلا اٹھے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اس کے چہرے پر محض ایک مریل سی مسکراہٹ
اٹھی جو فوراً دم توڑ گئی۔ وہ ہماری ہیلو کے جواب میں بے جان سا ہاتھ ہلاتا ہماری
میز کے گرد خالی پڑی ہوئی پانچویں کرسی میں آکر دھنس گیا۔ ہم سب اس بات کے منتظر
تھے کہ اس کے آنے سے محفل رونق پر آئے گی لیکن کیپٹن پرساد بالکل خاموش تھا۔

کیپٹن پرساد کی عمر پینتیس سال کی تھی وہ بھرتی کا مقامی افسر تھا۔ اس کی شادی
ایک بڑے گھر میں ہوئی تھی۔ سسر بڑے بااثر آدمی تھے اور ان کی ایک ہی لڑکی تھی
اس کے لمبے تکونی چہرے پر نہایت گھنی رانا پرتاپ شاہی مونچھیں تھیں جو کہ اس کی
ساری شخصیت پر چھائی ہوئی تھیں۔ اگرچہ وہ فوجی افسر تھا لیکن وہ ہمیشہ غیر فوجی لوگوں
میں ہی اٹھنا بیٹھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا۔ "دن بھر تو ان فوجی افسروں سے
دفتر میں واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے، شامیں بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ گزاری جائیں تو
انسان بور ہو جاتا ہے۔ زندگی صبح شام 'ساودھان' اور 'سیلوٹ' میں ہی گزر جاتی ہو!"
میرے خیال میں چونکہ کلب کے اکثر افسر اس سے بلند عہدے کے ہوتے، اسے ان سے ملنے
اور ان کے ساتھ بیٹھنے میں ایک کمتری کا احساس ہوتا تھا اسی لئے شاید وہ ان سے الگ
تھلگ رہنا چاہتا تھا۔

کیپٹن پرساد کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ اگرچہ وہ خود شعر تو شاذ و نادر ہی کہتا تھا لیکن
اسے اردو اور ہندی کے بڑے بڑے شعراء اور کویوں کا کلام کافی یاد تھا اور وہ موقع ملنے
پر کبھی کوئی غزل گا کر اور کبھی موقع کے مطابق شعر پڑھ کر ہم پر ہمیشہ اپنی دھاک جمایا کرتا
اگرچہ ہم میں سے کسی کو بھی اس فن کی سوجھ بوجھ نہ تھی اور ان اشعار کے معنی بھی سمجھ میں نہ
آتے تھے لیکن مہندر بڑی فراخدلی سے مکرر مکرر چلایا کرتا ایسے موقعوں پر مونچھ زانی

چودھری اور میں بھی محفل کا رنگ جمانے کی خاطر واہ واہ میں شامل ہو جاتے۔ دراصل مہندر نے حال ہی میں صدر میں ایک خوبصورت اسٹور کھولا تھا اور وہ کیپٹن پرساد کی واقفیت کا مکمل فائدہ اٹھانا چاہتا تھا لہٰذا اسے ہر حال میں کیپٹن پرساد کی خوشنودی حاصل کرنی تھی موچندانی ایک مشہور دوائیاں بنانے والی فرم کا نمائندہ تھا اور چودھری شہر کا مشہور کیمسٹ تھا اور کیپٹن پرساد کا کوئی جگری دوست ملٹری ہسپتالوں کے لئے دوائیاں خریدنے والے دفتر میں کسی نمایاں جگہ پر فائز تھا اور میں ان سب لوگوں کو ریڈیو بیچ چکا تھا۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ ہمارے تعلقات ایک دوسرے سے کسقدر گہرے تھے! لیکن ان سب سے الگ یہ کیپٹن پرساد کی زندہ دل شخصیت تھی جو ہم سب کو ایک دھاگے میں پروئے ہوئے تھی۔

کیپٹن پرساد ہمیں اکثر فوجی مہموں کے قصے سنایا کرتا۔ وہ کوریا، نیفا اور کشمیر کے محاذوں پر لڑ چکا تھا اور حال ہی میں غازا سے لوٹا تھا جہاں وہ ہندوستان سے بھیجی گئی یو۔ این۔ او کی حفاظتی فوج میں ایک افسر رہا تھا۔ اس کی باتوں میں بیحد رس تھا اور وہ واقعات کو اس تفصیل سے بیان کرتا کہ سننے والے کو یوں گمان ہوتا گویا وہ بھی اس کے دستے کا کوئی فرد ہو جو جنگلوں میں پہاڑوں اور صحراؤں میں اس کے ہمراہ دشمن کے ساتھ قدم قدم پر لڑا ہو ان میں خاص طور پر وہ قصے تو بیحد ہی دلچسپ و رنگین ہوتے جس میں رنگون، سنگاپور، ٹوکیو اور قاہرہ کی نائٹ کلبوں کا ذکر ہوتا۔ ان قصوں کو سناتے وقت کیپٹن پرساد کی آنکھوں میں ایک چمک آ جاتی اور موچندانی، مہندر، چودھری سب اپنی اپنی کرسیاں اور قریب گھسیٹ کر اپنے اپنے سانسیں روکے ان قصوں کو نہایت دلچسپی سے سنتے اُس وقت موچندانی بھول جاتا کہ گھر میں ایک موٹی سی عورت جو

اس کی بیوی تھی، گھڑی پر آنکھیں جائے، کسی گھریلو ہتھیار سے مسلح، اس کی آمد کی منتظر ہوگی۔ بھنڈارکر جو کہ ابھی کنوارہ تھا نہایت شدت سے اس بات کا احساس ہوتا کہ ایسے نائٹ کلب اپنے شہر میں کیوں نہ ہوئے۔ اور گنجے چودھری کو جس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنی شروع ہوجاتیں، ظاہراً ایسے قصّوں سے کوفت ہونے لگتی لیکن واقعہ تھا کہ سب سے زیادہ دھیان سے وہی ان قصّوں کو سنا کرتا۔ ہر ایسا قصہ ختم ہونے پر وہ اپنی ران پر یا پھر میز پر زور سے ہاتھ مارتا اور کہتا۔ "او کپتان کے بچے!" ان الفاظ سے یہ فیصلہ کرنا کبھی کبھی مشکل ہوجاتا کہ یہ الفاظ حسد سے بھرپور تھے یا حقارت سے!

عموماً اس میز پر کلب کے بیرے بھی بہت دلچسپی لیتے اور سروس میں ایک عجب پھرتی دکھاتے۔ اگرچہ ان میں سے کوئی بھی ظاہری طور پر سامنے کھڑا نہ رہتا لیکن ذرا سی آواز دینے پر بھی نہ جانے کن پردوں کے پیچھے کوئی چھپا ہوا بیرا آرڈر لینے کے لئے فوراً نمودار ہوجاتا۔ اس کی شاید ایک وجہ تو ہر منٹ منٹ پر وسکی کے آرڈر تھے اور یا پھر کیپٹن پرساد کی رونگٹے کھڑے کرنے والی مہمیں یا دل گرما دینے والے نائٹ کلبوں کے رنگین قصے!

کیپٹن پرساد اپنے ہی کسی خیال میں غرق، سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور ہم سب حیرت سے اس کی طرف تک رہے تھے۔

"کیوں پرساد؟ خیریت تو ہے!" میں نے پوچھا اور اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ جان کر ہم سب کو بہت تسلی ہوئی۔

"بیرا!" چودھری نے آواز دی "پرساد صاحب کے ڈبل وسکی!" تھوڑی دیر میں

بیرا نے گلاس سامنے آ کر رکھ دیا۔

"چیئرز!" مہندر نے کہا اور ہم سب نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لئے کیپٹن پرساد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہم سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا اور پھر "چیئرز" کہتے ہوئے جلدی سے ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے گلاس میز پر واپس رکھ دیا۔

"کیوں کیپٹن صاحب کیا بات ہے۔ آج آپ موڈ میں نہیں!" مولچندانی نے پوچھا۔ پرساد ابھی تک خاموش تھا۔

"کیپٹن صاحب کیا قصہ سنایا تھا آپ نے اس روز 'سیونارا' کا!" مہندر نے کسی جاپانی دوشیزہ کی مہین آواز میں، ہاتھ کی ایک دلفریب جنبش سے نقل اتارتے ہوئے کہا۔

سب ہنس دیے۔

"ارے جانے دے! جانے دے! تجھے یہ جاپانی، برمی اور حبشی لڑکیاں لے ڈوبیں گی!" چودھری نے حقارت بھرے لہجے سے کہا۔

"مہندر تو ڈوبنے کے لئے تیار ہے!" مولچندانی بول اٹھا۔ فضا میں قہقہے بکھر گئے۔ کیپٹن پرساد اب بھی خاموش تھا۔

"کیپٹن صاحب! آپ اس روز اس مصری رقاصہ کا قصہ سنانے کے لئے کہہ رہے تھے! کیا نام تھا اس کا؟" مولچندانی نے فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی تم لوگ تو ہر وقت لڑکیوں کے چکر میں ہی رہتے ہو؟" چودھری کے لہجہ میں کوفت کا اظہار تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اس نے اپنی کرسی قصہ سننے

کی غرض سے کیپٹن پرساد کے اور قریب سرکالی تھی۔

"ہاں اب یاد آیا اس مصری لڑکی کا نام ! رخسانہ!" مہندر بے اختیار بول اٹھا۔

"رخسانہ ہی تھی نا کیپٹن صاحب جو نیل کے کنارے کسی ریستوران میں ملی تھی آپ کو؟ جس نے ریستوران کی نیلگوں روشنی میں آپ کو کسی بیرے کے ہاتھ خط بھجوا کر خود آپ کو اپنی میز پر بلوایا تھا!"

سو لچندانی اشتیاق کے مارے میز پر جھک گیا۔ میں اپنا گلاس اٹھائے کیپٹن پرساد کی طرف نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور چودھری کے کان کیپٹن کے لب کھلنے کے لئے منتظر تھے۔

"پھر کیا ہوا تھا کیپٹن پرساد؟" مہندر نے پوچھا۔ "اس نے آپ سے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں کہا!" کیپٹن پرساد نے ایک ایک لفظ علیٰحدہ علیٰحدہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ خاموش ہو گیا ہو گویا اسے مہندر کا سوال نہایت ناگوار گزرا ہو ہم سب حیرت سے اس کی طرف تک رہے تھے۔

کیپٹن پرساد نے میز پر سے گلاس اٹھا لیا اور اس سے کھیلنے لگا گویا وہ کوئی اہم بات کہنے والا ہو۔

"دوستو۔ آج مجھے ایک اعتراف کرنا ہے!" ہماری دلچسپی بڑھنے لگی۔ شاید یہ الفاظ بھی کسی انوکھی کہانی کا آغاز تھے!

"میں کبھی قاہرہ نہیں گیا اور نہ میں نے آج تک دریائے نیل دیکھا ہے میں نہ کبھی رنگون گیا ہوں نہ کبھی سنگاپور۔ نہ میں کسی مصری رقاصہ رخسانہ کو جانتا ہوں نہ ایرانی دوشیزہ خانم کو۔ نہ میں رنگون کی یاما کو کبھی ملا ہوں اور نہ

ہی سنگاپور کی می می چانگ سے میرا کوئی واسطہ رہا ہے ۔ میں آپ کو آج تک فریب دیتا رہا ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ میں نے اپنے آپ کو فریب کے ملمع شدہ پردے میں چھپائے رکھا ہے !" اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کو ہونٹوں سے لگالیا اور اسے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر کے میز پر رکھدیا۔

"آپ یہ بھی سن کر حیران ہوں گے کہ میں نے کشمیر کی کسی لڑائی میں بھی حصہ نہیں لیا حالانکہ میں آپ کو اس لڑائی کے کئی قصے سنا چکا ہوں ۔ میں اس وقت مہو چھاؤنی میں محاذ سے بینکڑوں میل دور ایک فوجی کورس کر رہا تھا۔ نہ میں نے نیفا کی لڑائی میں کوئی حصہ لیا ہے اور نہ ہی میں نے کوریا میں کوئی جنگ لڑی ہے ۔ میں کشمیر، نیفا اور کانگو ضرور گیا ہوں لیکن صرف اس وقت جب جنگ ختم ہو چکی تھی ۔ اس سب کے لئے میں اپنی بیوی بلکہ اپنے سُسر کا شکر گذار ہوں !" اس کے ان الفاظ میں سخت طنز تھا!۔

بیرا نے خالی گلاس اٹھالیے اور ان کی جگہ نئے گلاسوں میں ڈالی ہوئی وسکی رکھدی۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرے سسر نہایت بااثر آدمی ہیں۔ اور میری بیوی ان کی اکلوتی لڑکی ہے جب کبھی میرا تبادلہ محاذ پر ہونے لگتا، وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اسے رکوا کر مجھے ان جگہوں پر تبدیل کروا دیتے جو محاذ جنگ سے کوسوں دور تھے ! میں نے آج تک کوئی جنگی مہم نہیں دیکھی، نہ مجھے معلوم ہے کہ بھوک پیاس، سردی، گرمی اور جان جوکھوں میں ڈالنا کیا چیز ہے ! میرا تجربہ صرف

ماں فوجی مشقوں تک محدود ہے جو میں نے میدان جنگ سے سینکڑوں ہزاروں میل دور کسی کیمپ میں محض چند دنوں کے لئے حاصل کیا ہے!"

"لیکن پرسوں ایک واقعہ نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہے۔ پرسوں دوپہر کو میں دفتر کے سامنے میدان میں کھڑا نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سب نکر یا انڈرویر اور بنیان پہنے فوجی معائنہ کے لئے کھڑے تھے۔ بہت سے دوسرے نوجوان میدان کے باہر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے آپ نہیں جانتے کہ بھرتی ہوتے وقت کسی بھی نوجوان کو اپنا نام لکھوانے کے لئے کتنا پکا ارادہ کرنا پڑتا ہے! میں نے کئی بار ان نوجوانوں کو دیکھا ہے جو بڑا حوصلہ کر کے بھرتی کے دفتر پہنچ تو گئے لیکن کچھ دیر بعد ان کے قدم وہیں ڈگمگانے لگتے ہیں اور وہ چپ چاپ وہاں سے کھسک جاتے ہیں!"

ہم کیپٹن پرساد کی باتوں کو نہایت دلچسپی سے سن رہے تھے۔ میز پر گلاسوں کے پیندے سے کتنے ہی خوبصورت حلقے بنا چکے تھے۔

"میں رنگروٹوں کی لائنوں میں گشت لگا رہا تھا کہ ایکا ایک میری نگاہ دو بچوں پر پڑی جو کہ اب لائن میں سب سے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے ان دونوں بچوں کے کندھوں سے سکول کے جزدان لٹک رہے تھے۔ بڑا لڑکا مشکل سے نو دس برس کا ہو گا اور چھوٹا سات آٹھ سال، کا دونوں بھائی معلوم ہوتے تھے اور وہ کسی بات کے لئے دبی زبان میں جھگڑا کر رہے تھے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے دفتر کے پاس ایک سکول ہے اور اس سے کبھی کبھار بچے بھرتی کا تماشا دیکھنے چلے آتے ہیں لیکن میں نے آج تک کسی کو اس بیباکی سے میدان

کے اندر رنگروٹوں کی لائن میں گھستے نہیں دیکھا تھا۔ میں ان کے پاس گیا وہ مجھے آتا دیکھ کر چپ چاپ بالکل فوجی انداز میں "سادھان" کھڑے ہوگئے۔ میں نے انھیں جب میدان سے باہر کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے کے لئے کہا تو بڑے لڑکے نے نہایت اکڑ کر ایک عجب شان سے جواب دیا "نو سر۔ ہم بھرتی ہونے آئے ہیں!" یقین مانیے میں ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا! کیا عزم تھا ان کے چہروں پر! چھوٹا لڑکا بولا "ہم بھی بھرتی ہوں گے! ہمارے پتاجی بھی مورچہ پر چینیوں سے لڑنے گئے ہیں!" آفرین ہے ان ماں باپ کو جن کے وہ سپوت ہیں! میں نے اسی طرح رعب دار آواز میں ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "تم۔ تم فوج میں کیا کرو گے؟ تم دونوں تو ابھی بندوق بھی نہیں اٹھا سکتے"! میری بات سن کر بڑا لڑکا تو کچھ سٹپٹا گیا لیکن چھوٹا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت نڈرتا سے بولا "تو کیا ہوا! اگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو ہم کم سے کم دشمن کی دو گولیاں تو ضائع کر سکتے ہیں!"

"واہ!" لدھیانی کے منھ سے بے اختیار نکلا

"بھئی کمال ہے! کیا جواب دیا!" چودھری بول اٹھا۔

"ہمارے بچوں میں بھی کتنا جوش ہے!" مہندر نے فخر سے کہا۔

"یقین مانیے۔ میں یہ الفاظ سن کر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ کہاں یہ کم عمر ننھے بچے جو چینیوں سے لڑنے کے لئے فوج میں اس قدر بے تاب اور کہاں میں ایک فوجی افسر جو میدان جنگ سے دور چھپا بیٹھا تھا۔!"

کیپٹن پرساد نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کلب میں میری آخری شام ہے میں نے پرسوں ہی اپنے سی۔ او سے کہدیا تھا کہ میں بھی فرنٹ پر جانا چاہتا ہوں اور آج مجھے ابھی چند منٹوں کے بعد محاذ پر روانہ ہو جانا ہے!" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی: "ارے میری گاڑی چھوٹنے میں کل چالیس منٹ باقی ہیں!"

اچھا خدا حافظ! بائی بائی!" اور وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر نہایت اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔ بیشتر اس کے کہ ہم میں سے کوئی کچھ بھی کہہ سکتا، وہ ایک عجب شان سے ہاتھ ہلاتا کلب سے باہر جا چکا تھا!

دوسرا بیٹا

(سوشیل رامپال کے نام)

ضلع لدھیانہ کے ڈپٹی کمشنر مہندر پال سنگھ کی میز پہ دو خط پڑے تھے۔ دونوں خط موضع گڑھی کے ایک بہادر سپوت کلیان سنگھ کے بارے میں تھے۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ یہ دونوں خط پرسوں شام ایک ہی ڈاک سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک خط ان کے اپنے اکلوتے بیٹے ہرپال سنگھ کا تھا جو فوج میں کیپٹن تھا اور جس نے محاذ سے لکھا تھا۔ دوسرا خط سرکاری تھا جس میں جمعدار کلیان سنگھ کی بہادرانہ موت کی خبر تھی اور جس میں سرکار نے کلیان کی بیوہ ماں کو پانچسو روپے کی بخشش دینے کے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب کی پیشانی پر گہرے تفکر کے اثرات تھے۔ دراصل کسی بھی

ماں کی آنکھوں سے اس کی اولاد کی موت پر بہائے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا و بھندر پال سنگھ اسے اپنی بس کا روگ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہی اصرار ان کے اپنے بیٹے کے خط میں بھی دہرایا گیا تھا۔ میز پر رکھا ہوا یہ ہلکے نیلے کاغذ پر لکھا ہوا خط ہوا میں پھڑپھڑاتا ہوا، انھیں گویا اپنے فرض کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ انھوں نے خط اٹھا لیا اور اسے پانچویں بار پڑھنے لگے۔

"کل کی لڑائی کا سہرا ہماری رجمنٹ کے جمعدار کلیان سنگھ کے سر رہا۔ میں اس تمام لڑائی کا حال نہیں لکھوں گا لیکن یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ اس نے میری موت اپنے سر لے لی۔ نہ صرف اس نے ذاتی طور پر مجھے ہی اور ہماری کمپنی کو جاپانیوں کے اچانک حملہ سے ہی بچایا بلکہ وہ شدید زخمی ہونے پر بھی اکیلا ایک چوکی کی حفاظت کے لئے آخری دم تک لڑتا رہا۔ یہ صرف اس کی بہادری، دلیری اور ہمت تھی کہ یہ چوکی دشمنوں کے ہاتھ نہ آسکی۔ ہماری کمپنی کا ہر سپاہی اس کا شکر گزار ہے کاش کہ ایسی بہادر موت ہم سب کا انجام ہو!

اس میں شک نہیں کہ کلیان سنگھ کو کوئی فوجی اعزاز ضرور ملے گا لیکن میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ کلیان سنگھ موضع گڑھی ضلع ارھیانہ کا رہنے والا ہے جو آپ ہی کا ضلع ہے ابھی پچھلے ہفتہ ہی اس نے مجھے اپنے ذاتی حالات بتائے تھے۔ اس کی ایک بیوہ ماں ہے اور ایک چھوٹا بھائی امر سنگھ جو زمین کاشت کرتا ہے۔ ڈیڈی آپ ان کے پاس ضرور جائیے گا انھیں بتایئے گا کہ کس طرح کلیان سنگھ بہادری

سے شہید ہوا اور ہم سب ساتھیوں کو اس پر کتنا ناز ہے۔ اس کی ماں اس پر جان چھڑکتی ہے۔ کاش میں ذاتی طور پر ان کے کسی بھی کام آسکتا اور آپ کلیان سنگھ کی ماں سے ضرور کہیئے گا کہ اگر کلو اس دنیا میں نہیں رہا تو کم سے کم وہ ہرپال کو ہی اپنا دوسرا بیٹا مان لیں، آج سے امر سنگھ میرا چھوٹا بھائی ہے!"......

مہندر پال سنگھ کو اپنے بیٹے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ ایک فوجی افسر کے ناطے اسے اپنے سپاہیوں کا خیال ہونا ہی چاہیئے تھا لیکن یہ جذبات اس کی ذاتی دلچسپی اور وابستگی کا اظہار تھے اس نے انھیں اور بھی مشکل میں ڈال دیا تھا وہ اس غمناک خبر کو کلیان سنگھ کی ماں تک پہنچانا اپنی طاقت سے باہر محسوس کر رہے تھے وہ اس بے چاری دکھیا کو کیا کہیں گے، کس طرح سے تسلی دیں گے؟ وہ خود فطرتاً کم گو تھے۔ انھوں نے بولنے سے زیادہ ہمیشہ عمل کو ترجیح دی تھی۔ وہ تو ٹھیک سے ماتم پرسی بھی نہ کر پائیں گے! ہرپال نے ان پر کتنی بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ اگر یہ معاملہ محض سرکاری ہوتا تو وہ شاید کسی نہ کسی طرح نپٹ لیتے لیکن ذاتیت کے عنصر نے اور خصوصاً اس امر نے کہ کلیان سنگھ ان کے اکلوتے بیٹے کی جان بچانے کے لئے بھی ذمہ دار تھا ان کے فرض کو اور بھی مشکل بنا دیا تھا۔

ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے بیٹے ہرپال کا چہرہ گھومنے لگا اور ان کی نظروں کے سامنے اس کے بچپن سے جوانی تک کے کئی منظر لمحہ بھر میں آکر چلے گئے۔ ماں کی گود میں مسکراتا ہوا گول مٹول اور صحتمند ہرپال، آٹھویں جماعت میں سکول بھر میں فرسٹ آنے پہ انعام لیتا ہوا ہرپال، ڈسٹرکٹ ہاکی ٹورنامنٹ

میں گول پر گول کرتا ہوا ہرپال، یونیورسٹی ٹینس ٹورنامنٹ میں سب کو ہراتا ہوا ہرپال اور پھر ڈیرہ دون ملٹری کالج میں پاسنگ پریڈ کی رہنمائی کرتا کیڈٹ آفیسر ہرپال سنگھ! اور پچھلے ہفتے شاید یہی ہنستا کھیلتا مسکراتا چہرہ ہمالیہ کی پر اسرار برفوں میں لہولہان ہو کر کہیں چھپ جاتا! ایک لمحہ کے لئے تو مہندر پال سنگھ کے جسم میں جھرجھری بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی اور انھیں ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔ لیکن خوش قسمت تھا ہرپال جس کی موت کی باری کلیان سنگھ کے سر آگئی ان کا تو بال بال کلیان سنگھ احسان کے قرضہ میں جکڑا گیا تھا، وہ یہ قرضہ کسی طرح بھی نہیں اتار سکتے تھے!

"حضور جیپ تیار ہے!" چپڑاسی کی اس اطلاع پر ڈپٹی کمشنر صاحب چونک پڑے "تحصیلدار صاحب بھی آگئے ہیں!"

"اچھا میں آتا ہوں!" مہندر پال سنگھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلنے پر تحصیلدار، ہیڈ کلرک اور ڈرائیور نے جھک کر سلام کیا۔

"وہ گرڈھی کے تمام کاغذ لے لئے نا!"

"جی سرکار" ہیڈ کلرک نے فوراً جواب دیا

"مجھے ابھی ابھی ہیڈ کلرک صاحب نے کلیان سنگھ کی موت کے بارے میں بتایا ہے بہت ظلم ہوا ہے بیچاری کرتار کور پر! پچھلے سال ہی اس کے خاوند کی موت ہوئی تھی اور اس سال جوان بیٹا بھی چلا گیا!" تحصیلدار نے کہا۔

"آپ اس خاندان کو جانتے ہیں؟" مہندر پال سنگھ نے پوچھا

"گرڈھی کے اس خاندان کو کون نہیں جانتا حضور! گاؤں کے کس نیک کام میں ان کا ہاتھ نہیں۔ گوردوارہ، کنواں، پنچایت گھر سبھی تو ان کے بنوائے ہوئے ہیں!

آپ کا تو حال ہی میں اس ضلع میں تبادلہ ہوا ہے، اور آپ کو اس دوران میں گڑھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا!"

"واقعی بہت ظلم ہوا ہے!" مہندر پال سنگھ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

ڈپٹی کمشنر صاحب ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے تحصیلدار، ہیڈ کلرک اور چپراسی پیچھے سے اچک کر بیٹھ گئے۔ جیپ شہر کے مکانوں کو پیچھے چھوڑتی کھلی سڑک پر آ گئی۔

سڑک کے کنارے کھیتوں میں نئی نئی بیجائی ہوئی دیکھ کر ہیڈ کلرک نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہا۔

"سرکار اب کے بیجائی بہت ہوئی ہے! کسانوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے! رام گڑھ والوں نے تو اپنے مقررشدہ کوٹے سے پچیس فیصدی زیادہ پیداوار بڑھانے کا چیلنج دیا ہے!"

"بہت خوب! مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ چینیوں نے ہماری قوم کو جگا دیا ہوا!"

"جی ہاں - ہمارے ہاں تو کئی لوگوں نے عدالتوں سے اپنے مقدمے واپس لے لئے ہیں!" تحصیلدار نے کہا

"خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے لوگ اپنا فرض سمجھنے لگے ہیں!" مہندر پال سنگھ نے فخر سے کہا

"حضور گڑھی کی پنچایت نے ۲۰ تولے سونا اور پانچسو روپے کی تھیلی آپ کی خدمت میں نیشنل ڈیفنس فنڈ میں دینے کی خبر بھجوائی ہے - کل وہاں مشکل سے پچاس گھر ہیں حضور!"

"اچھا یہ دم خم ہیں اس چھوٹے سے گاؤں کے!"

"اور ہاں حضور۔ وہاں کے بیسیوں جوان فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں! کوئی ایسا گھر نہیں جہاں سے دو چار جوان بھرتی نہ ہوئے ہوں اور اصل میں تو حضور کلیان سنگھ سے ہی ہوئی تھی!"

"میرے بیٹے ہر پال نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے! کلیان سنگھ بھی اسی کی رجمنٹ میں تھا!" اور پھر مہندر پال سنگھ کسی خیال میں غرق ہو گئے۔

جیپ کا سارا جسم ہلتا تھرتھراتا ہوا سڑک پر دوڑا چلا جا رہا تھا۔ ڈرائیور کے سامنے لگا ہوا پچھلی گاڑیوں کو دیکھنے والا شیشہ انجن کی تھرتھراہٹ اور کپکپاہٹ کے ساتھ کانپ رہا تھا اس لرزش کی وجہ سے تیزی سے پیچھے کھسکتی ہوئی سڑک اور درختوں کی قطاریں عکس میں مل مل کر گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ جیپ میں ہر بیٹھا ہوا شخص اس تھرتھراہٹ کو اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔ دفعتاً جیپ ایک کچے راستے کی طرف مڑی اور جیپ کو گرد و غبار کے بادلوں سے ڈھانپ لیا۔ ڈرائیور نے فوراً پگڑی کا پلو اپنی ڈاڑھی اور کانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ مہندر پال سنگھ نے بھی اپنی پگڑی کا پلو ڈاڑھی ڈھانپنے کی غرض سے سرکایا لیکن اسے کم پا کر جیب میں سے رومال نکال کر، کچھ پلو سے اور کچھ رومال سے چہرے کے بیشتر حصے کو ڈھانپ لیا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے چپراسی اور ہیڈ کلرک گرد کی وجہ سے کھانس رہے تھے اور تحصیلدار صاحب امڈتے ہوئے غبار سے بچنے کے لئے تمام حفاظتی کارروائیاں عمل میں لا رہے تھے۔

اور پھر ایکا ایکی خلافِ توقع، بجری کی سڑک شروع ہو گئی۔ گرد کے بادل ایک بگولے کی طرح بل کھاتے پیچھے رہ گئے۔ گرد کم ہونے کی وجہ سے بھچی ہوئی آنکھیں تھوڑی کھل گئیں۔ سڑک کے دونوں طرف کچھ عورتیں اور ادھیڑ عمر کے لوگ سڑک بنانے کے کام میں لگے ہوئے تھے۔

"اچھا! سڑک یہاں تک بن گئی!" تحصیلدار نے کہا۔

جیپ کو آتے دیکھ کر کئی لوگ سلام کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ تحصیلدار نے جیپ میں سے گردن نکال کر کسی کو پہچانتے ہوئے آواز دی "پٹواری جی!"

ایک شخص جیپ کے پیچھے بھاگنے لگا۔ جیپ رک گئی۔ قریب آنے پر پٹواری نے ڈپٹی کمشنر صاحب اور تحصیلدار صاحب کو آ کر نہایت نمرتا سے سلام کیا۔

"پٹواری جی آپ ہمارے ساتھ چلیئے۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ ہیڈ کلرک اور چپراسی نے پٹواری جی کو باہوں سے سہارا دے کر جیپ میں بٹھا لیا۔

"بہت جوش خروش سے کام ہو رہا ہے سڑک بنانے کا!" تحصیلدار صاحب نے پوچھا۔

"جی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے گاؤں آنے میں کتنی مصیبت ہوتی ہے! ہمارے جوان تو سب فوج میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی لئے کچھ کام سست ہے لیکن سارا گاؤں چاہتا ہے کہ جب ہمارے جوان لڑائی سے لوٹیں تو انھیں تو اس دھول گرد کی مصیبت نہ اٹھانی پڑے!"

"بہت اچھا ہے پٹواری جی۔ اگر سب گاؤں والے اسی طرح سوچیں تو نقشہ ہی بدل جائے!" ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پٹواری نے تحصیلدار سے ڈپٹی کمشنر صاحب کی اس غیر متوقع آمد کے متعلق پوچھا۔ جب اس نے کلیان سنگھ کی موت کے بارے میں سنا تو وہ ہکا بکا رہ گیا کافی کوشش کے بعد اس کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا

"بھگوان جانے اب کرتار کور کیا کرے گی۔!"

گاؤں اب بالکل قریب آگیا تھا۔ دائیں طرف جھادیہ کا پکا مندر نظر آرہا تھا اور اس سے پرے گوردوارہ کا اونچا کلس دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بائیں طرف ایک رہٹ اپنی مخصوص دھن میں رینگ رہا تھا۔

جیپ ایک چھوٹے سے پکے مکان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ پٹواری جلدی سے جیپ سے نیچے اتر آیا۔ مکان کے باہر دو ایک لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔

"اری سنتو جا۔ جا کر کرتاراں ماسی سے کہہ ڈپٹی کمشنر صاحب آئے ہیں!"

"ڈپٹی کمشنر صاحب!" لڑکی نے بھولے پن سے لفظ کو دوہراتے ہوئے کہا۔

"اری نہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب۔ کم۔ اِش۔ نر!" پٹواری نے کسی قدر غصے سے کہا۔ لیکن پھر ڈپٹی کمشنر صاحب کو مسکراتا دیکھ کر اس کا لہجہ نرم پڑ گیا اور وہ بھی لڑکی کی طرف دیکھ کر ذرا ہلکے سے مسکرا دیا۔ لڑکی اندر بھاگ گئی۔ اور پٹواری باہر سے آوازیں دینے لگا۔

چند ہی لمحوں میں ایک اٹھارہ بیس سال کا جوان باہر آیا۔

"ارے امر۔ تو آج جلدی گھر کیسے آگیا۔؟"

"ایسے ہی ذرا کام تھا!" اتنے میں ایک تنگ پونچے کی شلوار پہنے ایک

عورت امر سنگھ کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کون؟ ارے پٹواری جی؟ آؤ نا"

"ماں جی۔ ڈپٹی کمشنر آئے ہیں!" پٹواری نے کہا۔

"دھن بھاگ۔ دھن بھاگ آج تو کٹیری کے گھر نارائن آئے ہیں! اور آپ بھی تحصیلدار صاحب!" اس نے ڈپٹی کمشنر صاحب اور تحصیلدار صاحب کا سواگت کرتے ہوئے کہا۔ "اری رام دیئی ذرا چارپائی تو بچھا دے!" وہ ان معزز مہمانوں کو آنگن میں سے اندر بلاتی ہوئی برآمدے میں لے آئی۔ ایک طرف چرخہ پڑا تھا اور ایسے معلوم ہوتا تھا گویا وہ چرخہ کاتتے کاتتے ہی اٹھ کر آئی ہو۔

"امر۔ ڈپٹی صاحب کے لئے کرسی لاؤ نا!"

دو چارپائیاں ڈال دی گئیں اور ان پر چوخانہ دھاری والا کھیس بچھا دیا گیا چارپائیوں کے سامنے کرسی رکھدی گئی اور وہ خود چرخے کے پاس سے پیڑھی گھسیٹ کر کرسی کے پاس ایک طرف رکھکر بولی "بیٹھئے نا"

سب کے سب خاموش تھے۔ سب کی نگاہیں کرتار کور پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تندرست مضبوط جسم کی عورت تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے چہرے پر جھریاں آ گئی تھیں اس کی ساری شخصیت اور جلال اس کے ماتھا بھرے چہرے میں سمٹ کر آ گیا تھا اس کے چہرے سے شفقت اور محبت ٹپکتی تھی گویا وہ ماں پہلے تھی اور عورت بعد میں۔ نہ جانے اسے دیکھکر کیوں احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی انجانے طریقہ سے ان میں سے ہر ایک کی ماں کی طرح تھی۔ اس کا مقدس چہرہ، سکون اور شانتی کا آئینہ دار تھا جیسے وہ کسی پر غصہ ہو ہی نہ سکتی ہو۔ جیسے وہ ہر کسی کو معاف کر دے گی۔

لیکن پھر بھی یہ منحوس خبر سنانے کے لئے کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ خاموشی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کرتار کور انتظار یہ لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔

"ماں جی۔" گاؤں کا نوجوان پٹواری سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "ماں جی ڈپٹی کمشنر صاحب کلّو کی خبر لائے ہیں!"

"اچھا جی!" کرتار کور کا چہرہ خوشی کے جذبات سے کھل اٹھتا معلوم دیا "کیسا ہے کلو! دشمنوں کو پیٹھ تو نہیں دکھائی نہ اس نے!"

یہ سنتے ہی جیسے ہر کسی کے صبر کے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ مہندر پال سنگھ کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور وہ بڑی مشکل سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"ماں جی۔ کلو نے شہید ہو کر، آپ کا، گاؤں کا، اور سارے دیش کا نام اونچا کیا ہے! یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں یہ بُری خبر آپ تک پہنچانے کے لئے آیا ہوں!"

کرتار کور کی آنکھیں یکدم بھیگ گئیں اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں آنسو آ کر تیرنے لگے۔

"کلو میرے لڑکے ہرپال کی رجمنٹ میں ہی تھا۔ ہرپال نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی بلی دے کر نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے اپنے بہت سے ساتھیوں کو بچا لیا۔ دھنیہ ہیں آپ جنھوں نے ایسے سپوت کو جنم دیا!"

کرتار کور کی آنکھیں آبدیدہ تھیں لیکن ان آنکھوں نے ابھی تک کوئی آنسو نہیں ٹپکایا تھا۔

"واہگورو! واہگورو!" کرتار کور کی زبان سے صرف یہ لفظ نکلے۔

"ماں جی۔ میں اور دیش کے لوگ کلو اور آپ کے فرزند ارہیں۔ ہم لوگ کلو کی قربانی کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکتے۔" مہندر پال سنگھ کہہ رہے تھے۔ "آپ کے کلو نے میرے بیٹے ہرپال کی بھی جان بچائی ہے۔ ہرپال نے لکھا ہے کہ اس کی خوش قسمتی ہوگی اگر آپ اسے اپنا دوسرا بیٹا مان لیں!"

"جُگ جُگ جیئے ہرپال!" کرتار کور نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔" دسویں پادشاہ نے اپنے دونوں صاحبزادے دیواروں میں چنوائے۔ ان کے پتا گورو تیغ بہادر نے اپنا سیس کٹوا دیا کتنے ہی لوگ کھولتے کڑاہوں میں جل کر مرے خود دسویں پادشاہ نے کتنی مصیبتیں جھیلیں، کتنی قربانیاں دیں تب جا کر دیش اور دھرم کی رکھشا ہوتی ہے!"

اور پھر وہ رک کر بولی۔

"میری ایک بیٹی ہے!" کرتار کور اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ امر سنگھ کے پاس جا کر مہندر پال سنگھ سے بولی۔" سردار جی۔ امر میرا دوسرا بیٹا ہے آپ اسے بھی بھرتی کر لیجئے!"

میں اور میرے افسانے

یہ سنہ ۱۹۴۶ء ہے۔

میں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے پاس کرلیا ہے۔ آگرہ یونیورسٹی بھر میں میری پوزیشن پانچویں ہے۔ مجھے ادب سے عشق ہے۔ اب تک میرے دس پندرہ افسانے اردو اور انگریزی میں چھپ چکے ہیں۔ میرا ادارہ جرنلزم کو وسیلۂ حیات بنانا یا انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کرنے کا ہے۔ میری والدہ کو گزرے ۱۵ سال اور والد صاحب کو گزرے آٹھ سال ہو چکے ہیں۔ ورثہ میں ملی ہوئی رقم قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ زندگی کا زبردست اور فوری تقاضہ ہے کہ میں جلد از جلد اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو جاؤں۔

میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں!

میں دہلی کے ایک مشہور جرنلسٹ کے پاس جاتا ہوں۔ اس کے اخبار میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی تحریریں اور سرٹیفکیٹ دکھاتا ہوں۔ وہ مجھے تنخواہ دیے بغیر کام

کرنے کا موقع دینے کے لئے تیار ہے۔ وہ مجھ سے کہتا ہے۔ "تم جانتے ہو کہ اچھا جرنلسٹ بننے کے لئے سب سے ضروری شرط کیا ہے! انھیں لکھنے کو کھانے پر ترجیح دینا ہے۔ انھیں جرنلزم میں شائد شہرت ملے، نام ملے لیکن شائد روٹی نہ ملے!"

میں ایک معمولی انسان ہوں، کوئی سنیاسی یا فلاسفر نہیں۔ مجھ میں بھوکے پیٹ تپ اور ریاضت کرنے کی ہمت نہیں۔ میں جرنلزم کو خیر باد کہتا ہوں کرسٹ ماہم یا مختصر افسانہ پر ریسرچ کرکے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے خیال کو بھی ملتوی کر دیتا ہوں اور ایک نئے پبلک سکول میں انگریزی پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر کی نوکری کے ساتھ سمجھوتا کر لیتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ اس نوکری کے دوران میں کچھ اطمینان سے لکھنے پڑھنے کی فرصت تو رہے گی۔

لیکن اس نوکری کا تقاضہ ہے کہ میں ۲۴ گھنٹے اپنے آپ کو اسکول کے لئے وقف کر دوں۔ میں یکدم سو بچوں کی ماں اور ان کا باپ ہوں۔ صبح چھ بجے سے منھ ہاتھ دھونے کی نگرانی، ورزش، کھیلنے کھلانے لکھنے پڑھانے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک ان کی کاپیاں دیکھنا میری ذمہ داری ہے۔ چھٹی کے دن فالتو وقت ہونے کی وجہ سے بچوں کے چنچل دماغ اور بھی شرارتوں کی طرف مائل رہتے ہیں لہذا انھیں دن بھر منظم کھیل کود میں یا انھیں ڈرامہ بحث مباحثہ اور ایسے ہی دوسرے مشغلوں میں الجھائے رکھنا یہ بھی پبلک اسکول کے ماسٹر کی ذمہ داری ہو جاتا ہے لیکن مجھے دو سو روپئے بطور جیب خرچ ملتے ہیں کیونکہ مکان، فرنیچر، کھانا پینا، نوکر چاکر سکول کی ذمہ داری ہے۔ اس قدر تنخواہ تو کسی آئی اے ایس افسر کو بھی شروع میں نہیں ملتی لیکن لکھنے پڑھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل ہے۔ اس نوکری کا سب سے خوشگوار پہلو سال بھر میں ساڑھے تین ماہ کی چھٹیاں ہیں جس میں ادب سے رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہوں کچھ افسانے بھی لکھ لیتا ہوں لیکن

آٹھ مہینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ذہن کا معیار نویں دسویں جماعت تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ سوچتا ہوں اگر میں دو چار سال پبلک اسکول میں رہ گیا تو نمک کی کان میں نمک بن کر رہ جاؤں گا۔

میری نگاہ اسکول کے پرنسپل کی طرف جاتی ہے جو شاید ایک ہزار روپیہ تنخواہ پا رہے ہیں۔ میں اگلے پندرہ بیس سال کے بعد شاید کسی پبلک اسکول کے پرنسپل بننے کی تمنا کر سکتا ہوں اور میں اس بے رونق مستقبل سے ڈر اٹھتا ہوں۔ میں اسکول سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں کیونکہ ایسی نوکری سے نہ مجھے ذہنی تسکین مل سکتی ہے اور نہ مالی تسکین۔ اور پھر میں زندگی کی عام سطح پر رہنے کا قائل نہیں!

میں بزنس کے الٹ پھیر میں پڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہوں کہ تھوڑے سرمایہ سے شروع کیا ہوا کاروبار ڈگمگاتی ناؤ ہے جو کسی بھی دھارے کے ساتھ اور کسی بھی وقت غرق ہو سکتی ہے۔ بزنس چھوڑ کر بزنس میں نوکری کر لیتا ہوں۔ بزنس کی نوکری اور اس پر ترقی کی خواہش ایک حاسد عورت کی طرح آپ کی تمام تر توجہ چاہتی ہے۔ اب مالی تسکین ہے لیکن ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہوں مالی آسودگی میں اس ذہنی کشمکش کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے[1] دوست، میرے مونس یہ قتل ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ شور و اویلا مچاتے ہیں، ان خیر خواہوں کی تماشائیوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے اور وہ مجھ سے لڑ جھگڑ کر اس ذہنی دوشیزہ کو بچا لیتے ہیں، اور میں پھر دوراہے پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

مجھے اس ذہنی دوشیزہ سے والہانہ محبت ہے۔ میں نے سالوں اس سے عشق کیا ہے لیکن اس کی موجودگی میری دوسری حاسد بیوی کو بری طرح سے کھٹکتی ہے وہ اسے بالوں سے گھسیٹ باہر نکال دینا چاہتی ہے اور میں بے بس مجبور ہو جاتا ہوں کیونکہ میرا وسیلۂ حیات دوسری بیوی کو خوش رکھنے پر منحصر ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ میری دوسری بیوی کافی خوبصورت ہے۔ اپنے اندر ایک بے پناہ

---

[1] اگر میں ان دوستوں میں اپنے عزیز ترین دوست رام لعل کے نام کا ذکر نہ کروں تو احسان فراموشی ہوگی۔

جاذبیت اور دلکشی رکھتی ہے، مجھے ہر طرح سے خوش رکھتی ہے اور میری زندگی کی بیشتر سہولیات کا خاصہ خیال رکھتی ہے جس کے لئے میں اس کا بیحد ممنون ہوں لیکن وہ پرلے درجہ کی حاسد ہے اور تمام تر توجہ مانگتی ہے میں اس سے منت کرتا ہوں، سماجت کرتا ہوں کہ وہ اس بیچاری معصوم ذہنی دوشیزہ کو گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنے دے۔ اس کا کیا بگڑتا ہے بیچ کھیچے، روکھے سوکھے نوالے کھا کر بیچاری کو گزر کر لینے دو۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر مان جاتی ہے اور میں کبھی کبھی فرصت ملنے پر ایک نگاہ اسکی طرف دیکھ لیتا ہوں۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس حسین دوشیزہ میں وہ تمام اوصاف پیدا ہو جائیں جو میری دوسری حاسد بیوی میں ہیں لیکن یہ ایک دیوانے کا خواب ہے!

شاید میری طرح ہمارے دیش میں ہزاروں ادیب ایسے ہی دوراہوں پر کھڑے رہتے ہیں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جنھیں ایک حاسد عورت کا پیار بھی حاصل نہیں۔ پھر میرا شکایت کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ میں مجبوراً زندگی سے سمجھوتہ کر لیتا ہوں۔ سمجھوتہ ایک بہت بڑی چیز ہے۔ اسکے تو آپ بھی قائل ہونگے!

اچھا چھوڑیئے اسے! آپ تو اس دوشیزہ یعنی میرے فن کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں نا! میں ابھی تک پچاس ساٹھ افسانے لکھ چکا ہوں۔ یہ افسانے اردو، انگریزی اور ہندی میں چھپ چکے ہیں۔ سچ پوچھیئے گا تو لکھتا اردو میں ہوں، سوچتا انگریزی میں ہوں اور افسانے تینوں زبانوں میں چھپتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان میں سے ایک آدھ اخبار تامل یا مراٹھی میں بھی چھپنے کے بارے میں پتہ چلا تھا لیکن نہ کسی نے باضابطہ طریقے سے ہی اجازت لی اور نہ ہی میں کوئی سراغ نکال سکا! اس حاسد عورت کے ہوتے ہوئے فرصت ہی کسے ہے! افسانوں کا ایک مجموعہ "ویران بہاریں" چھپ چکا ہے، دوسرا "بوند بوند ساگر" آپ کے سامنے ہی ہے۔

اپنے اس فن کی تکمیل میں میرا دماغ نت نئے موضوع ڈھونڈنے میں لگا رہتا ہے۔ ایک ہی موضوع یا ماحول پر دو افسانے لکھنا مجھے منظور نہیں مجھے زندگی کی طرح ادب میں بھی عام سطح پر رہنا کچھ

عجیب سا لگتا ہے۔ شاید یہ میری خودی کا تصور ہے یا انفرادیت کی طرف جھکاؤ۔ مجھے ہر بار کردار ماحول یا مسئلہ زندگی کے ان گنت باریک پردوں میں سے چھپی ہوئی ایک نازک حسینہ کی طرح خاموش اشارے کرتا ہے میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی خاص قسم کے شعبہ، کردار طبقہ ماحول کے لیئے وقف نہیں کیا۔ اسی وجہ سے میرے پڑھنے والوں کو یا دوستوں کو میرے فن پر کوئی لیبل لگانے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔ میں نے ہمیشہ کھلی ہواؤں میں پرواز کیا ہے۔ میرے ذہنی دریچے زندگی کے ہر کونے سے نازک احساسات اور خدمات سے لدے ہوئے جھونکوں کے منتظر رہتے ہیں۔

میں نے تقریباً ہر قسم کے افسانے لکھے ہیں۔ کرداری افسانے، مسائلی افسانے، پلاٹ کے افسانے، ماحول کے بارے میں افسانے۔ دراصل کسی بھی افسانے کے لئے کردار، پلاٹ ماحول بھی ضروری ہیں لیکن ان میں سے کوئی نہ کوئی عنصر مرکزی خیال کو اجاگر کرنے میں زیادہ مدد دیتا ہے اسی نوعیت سے وہ افسانہ اسی عنصر کا افسانہ کہلایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شاید مسائلی افسانہ زیادہ تشریح طلب ہے۔ جب کبھی کوئی مرکزی خیال یا مسئلہ بذات خود افسانہ پر چھا جاتا ہے تو وہ مسائلی افسانہ بن جاتا ہے۔ کردار یا مختلف مسائل ہی میرے محبوب ترین موضوع ہیں۔ فسادات کے بعد بچوں کا مسئلہ 'ویران بہاریں'، کا موضوع ہے عورتوں کا مسئلہ 'کانٹا' کا ہڑتال 'روشنی' کا بڑھتی ہوئی آبادی 'پل کے نیچے' کا وغیرہ وغیرہ ان میں سے ہر کوئی افسانہ ان مسئلوں پر کسی نئے انداز سے روشنی ڈالتا ہے اور ان مسئلوں کی اہمیت جتاتا ہے۔ ایک مسائلی افسانہ کے لئے کوئی حل تجویز کرنا ضروری نہیں آخر ایک افسانہ نگار مدبر نہیں اس کا کام تو ان مسئلوں کو فن کی حدود میں رہ کر جذباتی طور پر پیش کرنا ہے تاکہ قارئین ان کی اہمیت سے واقف ہو کر سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو جائیں وہ صرف اسی طرح سے سماج اور دیش کی سیوا کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک ہر فنکار کی سب سے بڑی ذمہ داری ان عناصر کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے جو انسان کے لئے مضر ہیں اور ان عناصر کو تقویت پہنچانا ہے جو انسان کے لئے

مفید ہیں اس لحاظ سے میں فن میں مقصدیت کا قائل ہوں بشرطیکہ یہی مقصدیت فن کے بنیادی لوازمات کو مجروح نہ کرے اور یہ پیغام فن کی کسوٹی پر پورا اترتا ہوا، دل کی گہرائیوں کو چھوتا قارئین کے دل و دماغ پر ایک پائندہ نقش ضرور چھوڑ جائے پچھلے دور کے بعض چند ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھ افسانہ ایک نعرہ بن کر رہ گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ذہنی تخلیقات کبھی بھی ادب کے زمرے میں شامل ہو سکیں گی۔ ان مسائلی افسانوں کو لکھتے وقت میری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ تخلیقات فن اور سماجی تقاضوں دونوں کو پورا کریں

میرے کرداری افسانے اکثر مسائل کی پیداوار ہیں 'چنگاری' کے ناگر جی دلیش کے ان نیتاؤں میں سے ہیں جو اپنی شاطرانہ چالوں کے باوجود چیف منسٹر نہ بن سکنے کی وجہ سے حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں لیکن موقعہ ملنے پر کون جانے وہ پھر نہ سلگ اٹھیں گے۔ بائلر کی دیکھ بھال کرنے والا بہرہ بنتو مستری جو اس مشینی دور میں فیکٹری کے فورمین کے ظلم و جبر کا شکار ہے انسان کے مقابلے میں اپنے بائلر کو زیادہ ہمدرد اور کارآمد پاتا ہے۔ جنگی مہموں کے دلچسپ قصے سنانے والا کیپٹن پرساد جو دراصل ہر محاذ سے منہ چھپائے رہتا تھا وقت پڑنے پر چینیوں سے لڑنے فرنٹ پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اور آپ کو کئی ایسی کئی اور مثالیں ملیں گی۔

پلاٹ کے افسانے میرے ہاں بہت کم ہیں شاید اس لئے کہ پلاٹ کا صحیح میدان ناول یا ڈرامہ ہے، مختصر افسانہ نہیں پھر بھی 'اجنبی' اور 'قلمی دوستی' ایسے افسانے ہیں جو اس صیغہ کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرے ہاں ایسے افسانے اور کردار بھی ملیں گے جو محض دل بہلاوے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ادب کے مقصد کے بارے میں جان میسفیلڈ (JOHN MASFEILD) کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں وہ لکھتے ہیں "ادب کا مقصد تفریح اور دل بہلانا، راہ راست پر لگانا اور نصیحت کرنا قلبی اور روحانی تسکین پہنچانا ہے۔" مجھے صرف یہی عرض کرنا ہے کہ میرے تمام افسانے اس کسوٹی پر پورے

اترتے ہیں۔ فاختہ اور "ڈیکوٹا" "قلمی دوستی" "ایکسپرٹ" ح م گ وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں جن کا مقصد دل بہلاوا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے زندگی کی دائمی اور صحتمند قدروں کا پورا پورا پاس ہے۔

مجھے افسانے کے فنی لوازم کا شدید احساس ہے شاید اس کی وجہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر صاحبان تھے جنہوں نے مجھے پہلی بار مختصر افسانہ کے فن اور تنقیدی اصولوں سے روشناس کرایا، یا سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی تھی جس کے تحت میں نے انیچ، جی، ویلز، ہیٹیں ہو یا ساں اور او ہنری کے افسانوی شاہکاروں کے ترجمے کئے یا لندن اسکول آف جرنلزم کے مختصر افسانے کا کورس تھا جہاں مجھے ان اصولوں کو پابندی سے اپنے افسانوں میں ڈھالنے پر اصرار کیا گیا۔ بہر حال میری کوشش یہی رہی ہے کہ میرے افسانوں میں کہیں کوئی فنی لغزش نظر نہ آئے اگرچہ میں فارمولا افسانوں کا قائل نہیں لیکن کبھی کبھی اردو کے چند اچھے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ان خامیوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور پھر ہمارے ہاں جب کچھ نقاد حضرات بھی بعض اوقات ان فنی لوازمات سے ناآشنائی برتتے ہیں تو یقینی طور پر اچنبھا ہوتا ہے۔

میں نے اپنے افسانوں میں جہاں تک ہو سکا کوشش کی ہے کہ میرے کردار گوشت اور پوست کے نظر آئیں ان میں وہی کمزوریاں اور کردار کی بلندیاں ہیں وہ اسی طرح ایماندار یا بے ایمان ہیں خوش اخلاق یا بدذوق ہیں جیسے عام زندگی میں انسان ملتے ہیں۔ وہ لنگڑے اور اپاہج بھی ہیں ان میں سے کسی کی آنکھ پتھر کی بنی ہوئی ہے اور کوئی ہکلا تا ہے، کوئی حسین بھی ہے اور کسی کا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا بھی ہے، وہ ہماری ہی دنیا کے انسان ہیں۔

کردار نگاری کے بارے میں منفی شخصیت کا قائل ہوں میرے نزدیک ایک سچے فن کار کی اپنی کوئی شخصیت نہیں۔ افسانہ کا مرکزی خیال اور

TREATMENT طے کر لینے کے بعد ایک فنکار کو اپنے ہر کردار کے ساتھ ہم آہنگ کر دینا نہایت ضروری ہے اگرچہ وہ اچھے اور برے کرداروں کا خالق ہے لیکن اچھے کردار کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی تمام تر ہستی اس میں سمو دے اور برے کردار کا ذکر کرتے وقت اس کا اپنی شخصیت کو اسی کردار میں کھو دینا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ افسانہ نگار کا مرکزی خیال کرداروں کی شخصیت یا واقعات کے ٹکراؤ سے خود بخود ابھرنا چاہیئے۔ اسے خارجی طور پر افسانہ میں کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔

میں نے اکثر اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذہن ٹٹولنے کی کوشش کی ہے۔ میرے بیشتر افسانے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں شاید اس میں میری اپنی ہی نفسیات کو کچھ دخل ہو گا۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر اور اس کی نفسیاتی گتھیاں سلجھانا ضروری ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک فرم کا مینیجر جو اپنے گاہکوں کی نفسیات سمجھنے میں کبھی دھوکا نہیں کھاتا یہ جانتے ہوئے بھی کہ سردار امریک سنگھ سے رقم واپس ملنے کی امید بیکار ہے، اسے ادھار دینے پر تیار ہو جاتا ہے یا ایک غریب رکشا والا جو اپنا خون بیچنے کے لئے ایک کمپاؤنڈر کا سہارا لینے پر مجبور ہے اسی کمپاؤنڈر کو قتل کی دھمکی دیتا ہے یا ایک نچلے متوسط طبقے کی عورت جو محض گرمی سے بچنے کے لالچ میں پہاڑ کی سیر کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور اس سال گرمی نہ پڑنے کی وجہ سے سخت مایوس ہو جاتی ہے اپنی سہیلی سے کہنے پر مجبور ہے کہ وہ ہر سال پہاڑ جایا کرے گی یا ایک یتیم خانے آشرم کی آٹھ نو سالہ لڑکی جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ماں کو قتل ہوتے دیکھا تھا اور جو انسان اور انسانیت پر تمام وثوق اس کھو بیٹھی تھی پھر سے انسانی ہمدردی کی راحت بخش گرمی ملنے پر اپنے ہاتھوں تیار کیا ہوا نفسیاتی خول توڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور نہ جانے کتنے ہی ایسے سوالات میرے ذہن میں گھومتے ہیں اور افسانوں کو جنم دیتے ہیں۔

میں نے اپنے افسانوں میں ماحول نگاری اور جزئیات کی طرف دانستہ طور پر توجہ دی ہے۔ دراصل افسانہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جسے افسانہ نگار سچ منوانے کی فکر میں رہتا ہے یقین مانیئے کہ کسی کامیاب افسانہ نگار

یا اکبر سے بڑھ کر دروغ گوئی کو سچ منوانے میں اور کوئی بازی نہیں لیجا سکتا۔ کامیاب افسانہ وہی ہے جہاں قاری کا ذہن بغاوت کئے بنا افسانے کی ہر تفصیل کو صحیح تسلیم کر لیتا ہے جزئیات میں ذرا سی لغزش افسانے کے طلسم کو توڑ کر رکھ سکتی ہے اسی لئے میں نے ہر افسانہ لکھنے سے پہلے اس کے ماحول کا باریکی سے مشاہدہ کیا ہے اسی جزئیات کی خاطر میں نے کسی ماحول کے متعلقہ لوگوں سے اکثر تفصیلات اکٹھی کی ہیں اخباروں کے تراشے اپنی فائلوں میں لگا رکھے ہیں مختلف اور نئے نئے موضوعوں پر کتابیں پڑھنے کی کوشش کی ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے کبھی کبھی ویسے ماحول میں رہ کر بھی اپنی معلومات بڑھائی ہیں اگر میں اپنے افسانوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھوں تو مجھے یقین ہے کہ ہر کہانی کی پس منظر کہانی اس سے بھی شاید زیادہ دلچسپ ہو گی۔

ماحول اور جذبات نگاری میں میں نے ہمیشہ سمرسٹ ماہم اور ویلز کو اپنا ماڈل تسلیم کیا ہے۔ ماہم نے خود دوسرے ملکوں میں جا کر وہاں کے مناظر اور ماحول کو اپنے افسانوں میں نہایت خوبصورتی سے سمویا ہے حتیٰ کہ پڑھنے والا اسی فضا میں سانس لینے لگتا ہے، ویلز نے اپنے افسانوں میں سائنس کے ہر شعبے کے ان حیرت انگیز تجربوں کا ذکر کیا ہے جو اس زمانہ کے سائنسدانوں کے تخیل میں تو تھے لیکن ابھی ان کی دسترس سے باہر تھے ایسے موضوعوں کو ممکن کی حدود میں لانا ماحول اور جذبات نگاری کا ایک بڑا کارنامہ تھا کیٹس سے میں نے "منفی شخصیت" کا اصول اور پانچوں حسوں کے ذریعے ہر ماحول کو کاغذ پر اتارنا سیکھا ہے۔ رابرٹ براؤننگ کے منظوم افسانوں سے کرداروں کا ڈرامہ سے بھرپور نفسیاتی تجزیہ کرنا سیکھا ہے اور ورڈزورتھ کی طرح ہی اس مقولے کا قائل ہوں کہ ہر ماحول فرد اور کے موڈ کے مطابق ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے اردو افسانہ میں مجھے کرشن چندر کی زبان کی روانی بیان کی لطافت اور شوخی، عصمت اور منٹو کے افسانوں کی کردار نگاری، بیدی کے لطیف نفسیاتی اشارے منٹو، بیدی اور قاسمی کے فنی توازن نے مجھے کافی متاثر کیا ہے۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں ان خوش قسمت افسانہ نگاروں میں سے نہیں جن کے ذہن میں لکھنے سے پہلے ہی کردار اور پلاٹ کی ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیلات سامنے آجاتی ہیں میرے سامنے

اکثر افسانہ کا مرکزی خیال اور اس کا کلائمکس ہی واضح صورت میں ہوتا ہے لیکن پلاٹ یا کرداروں کے بارے میں محض ایک ہلکا سا تصور ہی ہوتا ہے۔ افسانہ کا مرکزی خیال ہی ٹیکنیک کا فیصلہ کرتا ہے کہ افسانہ صیغۂ غائب میں لکھا جائے یا کسی ایک کردار کی نظر سے جذباتی طور پر لکھا جائے یا واقعاتی طور پر یا کسی اور ڈھنگ سے FLASH BACK فلیش بیک ٹیکنیک میں لکھا جائے یا کسی واقعہ سے، گفتگو یا کسی کردار یا ماحول کے بیان سے شروع کیا جائے۔ لکھتے لکھتے پلاٹ اور کردار خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں اور افسانہ ختم ہو جانے پر مجھے کوئی اہم تبدیلیاں کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ افسانہ صاف کرتے وقت میں نہایت کڑائی سے ان تمام خامیوں کو نکالنے کی کوشش کرتا ہوں جو تسلسل، جذبات یا تفصیل نگاری میں آگئی ہوں میں ان جزئیات میں بھی دانستہ طور پر اضافہ کرتا ہوں جو افسانہ، کردار یا بیان میں نکھار پیدا کر دیں میں، ایک جلاد کی سی بے رحمی کے ساتھ ہر ممکن فالتو لفظ کاٹنے کی کوشش کرتا ہوں جو افسانہ کے مرکزی خیال سے تعلق نہیں رکھتا یا اسے کلائمکس تک پہنچانے میں مدد نہیں دیتا۔ میں نے اپنے افسانوں میں بعض مرتبہ فلمی ٹیکنیک کے اشاروں کا بھی استعمال کیا ہے کہانی کے TEMPO کو بڑھانے کے لئے ڈیزالو DISSOLVE فیڈ ان اور فیڈ آوٹ بہت مدد دیتے ہیں "سوکھا جھرنا" کا ایک منظر حاضر ہے۔ کہانی کا ایک کردار تانگے والا ہے جو بیمار ہو جانے پر گھوڑا بیچ کر ایک رکشا خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"جب اس نے بیماری سے فراغت پائی تو اس کے تانگے کے پہیئے تیلیے سلاخدار پہیوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔"

یہ جملہ ایک ڈرامائی طریقہ سے پڑھنے والے کے سامنے کردار کی زندگی کا بدلا ہوا منظر پیش کرتا ہے۔

اسی طرح فلمی تشبیہیں اور استعاروں سے بھی کام لیا گیا ہے مثال کے طور پر اسی افسانہ کا یہی کردار جو اپنے ماں، باپ کے ساتھ دہلی کے کوچۂ قاسم جان میں پرسکون زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے ایکایک فسادات کے طوفان سے دوچار ہوتا ہے۔

"اتنے میں فسادات کی سیاہ آندھیاں آئیں تانگے کا ڈھر دور جا گرا۔ سواریاں گر گئیں اور اس کے ماں باپ فسادات کے گہرے دھوئیں میں کھو گئے۔"

کبھی کبھی کوئی لانگ شاٹ افسانہ کے ڈرامائی تاثر کو بھرکا دیتا ہے اس سلسلے میں افسانہ 'نئے پرانے' کا ایک منظر حاضر ہے۔ افسانہ کے ہیرو راجندر کی شادی ہو رہی ہے اور عین شادی کے وقت اس کے تایا چودھری ہیمراج لڑکی والوں سے ۵ ہزار کا تقاضہ کرتے ہیں، راجندر بیاہ منڈپ میں بیٹھا دور ایک برآمدے میں یہ ساری کاروائی ہوتے دیکھ رہا ہے وہ وہاں سے صرف اپنے تایا اور ان کے دوست دیوان بشن داس کے ملتے لب اور پر معنی حرکات ہی دیکھ سکتا ہے۔

"پنڈت اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ بیاہ منڈپ میں سے کچھ اور بزرگ اٹھ کر ان تینوں کے پاس چلے گئے، چودھری ہیمراج بڑے جوش و خروش سے بول رہے تھے انھوں نے ایکدم گھوم کر راجندر کی طرف اشارہ کر کے باہیں پھیلا کر پاؤں سے کمر تک ہاتھ لیجا کر اسکی کوٹ پتلون کا واسطہ دیا، گردن کے گرد ہاتھ پھیر کر جیسے اس کی ٹائی کا واسطہ دیا پھر ہاتھ کی تین انگلیاں ہوا میں بلند کر کے شاید راجندر کی تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ کا واسطہ دیا پھر اسی کے ساتھ منھ پھیر کر یوں چلنے لگے گویا وہ بارات واپس ہی لیجائیں گے۔ لالہ سندر لال نے سخت مایوسی اور منت کی حالت میں سر سے پگڑی اتار کر چودھری ہیمراج کے پیروں میں رکھدی اور چودھری ہیمراج نے بڑی سختی سے پگڑی روند ڈالی۔"

میرے نزدیک ہر افسانہ نگار کے ذہن میں مرکزی خیال ایک ہی طرح سے آتے ہیں کسی واقعہ سے کسی کردار سے، کسی ماحول سے متاثر ہو کر چاہے وہ حقیقی زندگی میں ہو یا کسی کتاب میں، کوئی خاص جملہ کسی کردار کی کوئی ادا یا مخصوص عادت، کسی ماحول کی کوئی انوکھی تفصیل، کوئی ڈرامائی سین جو کہ نقطۂ عروج کو جنم دے سکے۔ یہی تمام عناصر ہیں جو کسی مرکزی خیال کے پیچھے متحرک ہوتے ہیں میں نے ہمیشہ فوری

تاثر کے تحت قلم اٹھانے سے گریز کیا ہے میں ورڈز ورتھ کی طرح EMOTIONS RECOLLECTED IN TRANQUILITY کا قائل ہوں میں ایسے مرکزی خیالات کو ذہن کے کسی گوشہ میں محفوظ کر لیتا ہوں اور انھیں اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بھٹی میں پکنے دیتا ہوں۔ میری فائل میں اخبارات کے کئی تراشے ہیں لطیفے اور واقعات ہیں جو برسوں میرے دماغ کی دیواروں سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ لاشعور کی گہرائیوں میں پرورش پاتے رہتے ہیں حتی کہ کوئی تازہ خیال، کوئی تازہ واقعہ انھیں پھر سے ابال دے دیتا ہے اور وہ ایک نئے اور تازہ انداز سے کاغذ پر اترنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وقت کی دوری کی وجہ سے چھلکے اتر جاتے ہیں اور میں ایسے بنیادی تصورات کو فنی تقاضوں کے تحت تشکیل دے دیتا ہوں۔ میرے افسانہ "چنگاری" کا مرکزی خیال ایک چیف منسٹر کی موت کی خبر پڑھ کر ذہن میں آیا تھا لیکن افسانہ ایک لمبی مدت کے بعد ہی لکھا گیا تھا۔ اسی طرح "تیس سال پہلے" کا مرکزی خیال کم سے کم پندرہ سال میرے ذہن کی چار دیواری میں بھٹکتا رہا لیکن اتنے لمبے عرصے کے بعد ایک طوفانی رات نے اسے ذہن کے گوشہ سے نکالا اور میں افسانہ لکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔ بھولی یادوں کی کرچیں ذہن میں اکثر چبھتی رہتی ہیں اور خیالات کروٹ بدل بدل کر دستک دیتے رہتے ہیں، اور پھر ایک دن وہ میری دوسری بیوی کی آنکھ چرا کر نہایت منیجر کن طریقے سے کاغذ پر ناچنے لگتے ہیں اور پکارتے ہیں۔ "ہمارے افسانہ نگار! آؤ ہمیں اپنالے!"

پھر اس کے بعد میرے لئے اور چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے!

ستیش بترا

"الوک" وزیر حسن روڈ لکھنؤ

۷ جولائی سنہ ۶۳ء